تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر:

ناسٹلجیا کے تناظر میں مطالعہ

مقالہ نگار:

رفیع الدین

269-FLL/MSURDU/F20

نگران:

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو، کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

K

Accession No. TH-27399

M.A

۸۹۱.۴۳۹

رقم

حوالہ جاتی مطالعہ۔ اردو ادب

اردو ادب۔ حوالہ جات۔ اردو نظم و نثر۔

اردو نثر۔ حوالہ جات

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں انشائی عناصر

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر:
ناسٹلجیا کے تناظر میں مطالعہ

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

رفیع الدین

رجسٹریشن نمبر:269-FLL/MSURDU/F20

مقالہ برائے ایم ایس (اردو)

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیہ زبان و ادب

شعبۂ اردو

کلیہ زبان و ادب

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور ایم ایس اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر: ناسٹلجیا کے تناظر میں مطالعہ**

مقالہ نگار: رفیع الدین

رجسٹریشن نمبر: 269-FLL/MSURDU/F20

کمیٹی دفاعِ مقالہ

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد
ایسوسی ایٹ پروفیسر
علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر بی بی امینہ
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
چیئرمین، شعبہ اردو

اگست، 2023ء

اقرار نامہ

میں رفیع الدین، رجسٹریشن نمبر:269-FLL/MSURDU/F20 اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان **"مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر: ناسٹلجیا کے تناظر میں مطالعہ"** میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

رفیع الدین

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

رفیع الدین نے رجسٹریشن نمبر:269-FLL/MSURDU/F20 کے تحت اپنا تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو بعنوان **"مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر: ناسٹلجیا کے تناظر میں مطالعہ"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحن کو بھجوا دیا جائے۔

نگران: ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرستِ موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اول:**	
	نفسیات اور ناسٹلجیا: بنیادی مباحث	۱
	حوالہ جات	۲۹
۲۔	**باب دوم:**	
	مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر و اقداری ناسٹلجیا: تلاش و تعین	۳۱
	حوالہ جات	۶۰
۳۔	**باب سوم:**	
	مشتاق احمد یوسفی کے رویوں میں ناسٹلجیائی عناصر: شخصی و نفسیاتی تجزیہ	۶۳
	حوالہ جات	۸۹
۴۔	**باب چہارم:**	
	مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا: مثبت قوت یا انفعال؟	۹۱
	حوالہ جات	۱۱۷
	ماحصل	۱۲۰
	کتابیات	۱۲۵

پیش لفظ

الحمد للہ تحقیق کا جو سفر شروع کیا تھا اللہ تعالیٰ کے حکم سے اختتام پذیر ہوا لیکن یہ سفر چند لوگوں کی محبت اور تعاون کے بغیر ناممکن تھا لہذا ان کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ اپنے نگران ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب جن کا میں تہ دل سے ممنون رہوں گا موضوع کے انتخاب، موضوع کی کانٹ چھانٹ، موضوع کے دفاع میں میرا جس طرح ساتھ دیا ہے میری راہ نمائی کی ہے اس کا رسمی طور پر لفظ شکریہ کافی نہیں۔ تحقیقی مقالے کے آغاز سے اختتام تک مختلف کتابوں کے حوالے سے رابطہ رہا۔ میری راہ نمائی کرتے رہیں۔ آپ ایک شفیق استاد اور علم دوستی کا عملی نمونہ ہیں۔ حقیقی معنوں میں ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کی زیر نگرانی مقالہ لکھنا میرے لیے باعث فخر اور باعثِ اعزاز ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈین فیکلٹی زبان و ادب ڈاکٹر پروفیسر نجیبہ عارف کا بے حد شکریہ جن کے قیمتی مشوروں اور تعاون سے موضوع کے حوالے سے راہ نمائی ہوئی۔ موضوع کے انتخاب کے دوران متعلقہ کتابوں تک میری رسائی کا سبب بن کر میری راہ نمائی کی۔ مقالہ لکھنے کے دوران پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کی جانب سے ملنے والی ہدایات نے میرے لئے مشعل راہ کا کردار ادا کیا ہے۔ لاریب! ڈاکٹر نجیبہ عارف ایک علمی شخصیت اور کامل انسان ہیں۔ آپ کی علمی و فکری شخصیت سے استفادہ اٹھانا میری خوش بختی ہے اس کے ساتھ شعبے کے تمام اساتذہ ڈاکٹر کامران کاظمی، ڈاکٹر ارشد معراج، اور ڈاکٹر مظہر علی طلعت کے تعاون کا ممنون ہوں۔

مقالہ لکھنے کے دوران دوست احباب نے کتابوں کے ذریعے تعاون کیا ان میں سید حسنات احمد، محمد مدثر، محمد تیمور، محمد عمران اور وسیم عباس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اپنے احباب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

مقالہ بنیادی طور پر چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ناسٹلجیا اور نفسیات کے باہمی ربط اور ناسٹلجیا کے ابتدائی تعارف کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

مقالے کے دوسرے باب میں مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر اور اقداری ناسٹلجیا کی تلاش و تعین کی گئی ہے۔ اقدار، روایات اور اقداری ناسٹلجیا کے مباحث کو بیان کیا ہے۔ کہ بدلتے وقت کے ساتھ انسانی رویوں میں جو تبدیلی آتی ہے اس کے اثرات انسان اور معاشرے پر کیسے مرتب ہوتے ہیں۔ ان عناصر کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

مقالے کے تیسرے باب میں مشتاق احمد یوسفی کے رویوں میں ناسٹلجیائی عناصر کی تلاش و تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ متعلقہ کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کرداروں کے رویوں میں ناسٹلجیائی رجحان کی نشاندہی کی ہے اور ناقدین کی آرا کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا ہے۔

مقالے کے چوتھے باب میں ناسٹلجیا کو یوسفی کی نثر میں مثبت قوت یا انفعال؟ کے طور پر تجزیہ پیش کیا ہے۔ ناقدین کی آراء اور مشتاق احمد یوسفی کے کرداروں کے رویوں میں ناسٹلجیائی رجحان کے مثبت اثرات اور انفعال کے حامل اقتباسات کو پیش کیا ہے۔

مقالے کے آخر میں ماحصل کے عنوان سے عمومی تجزیہ پیش کیا ہے جس میں چاروں ابواب کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ آخر میں مقالے کی علمی و ادبی نوعیت اور معیار کا فیصلہ اہل علم پر چھوڑ رہا ہوں۔ میری جانب سے یہ ایک ادنی کوشش ہے۔

آخر میں مقالے کو کمپوز کرنے پر اپنے بڑے بھائی محترم محمد اسحاق خان کا شکریہ ادا کرتا ہوں. اپنے استاد اور نگران ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے تعاون سے یہ موضوع باقاعدہ مقالے کی صورت میں اختتام کو پہنچا۔

رفیع الدین

ایم ایس اردو

باب اول:

نفسیات اور ناسٹلجیا: بنیادی مباحث

باب اول

نفسیات اور ناسٹلجیا: بنیادی مباحث

نفسیات انسانی رویوں، خیالات، افکار اور جذبات کا سائنسی مطالعہ ہے۔ نفسیات میں کرداروں کی نفسیات، حرکات و سکنات واقعات کے سیاسی و سماجی اور معاشی محرکات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ادب میں نفسیاتی مطالعے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں یہ زاویہ فکر ادب اور فن پارے کی تشریح و توضیح میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ فن پارے کی نفسیاتی جہات کا مطالعہ انسانی تجربے اور ارد گرد کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرنے کے طریقوں کی پرکھ ایک ادبی تنقیدی و توضیحی سرگرمی ہے۔ فن پارے میں نفسیاتی عناصر کی تلاش و تعین کے ذریعے انسانی رویوں، خیالات، افکار و نظریات اور ذہنی عمل کے پیچیدہ مباحث کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ ادب میں نفسیاتی عناصر کی تلاش و تعین انسانی تجربے و مشاہدے کی گہری سمجھ حاصل کرنا ہے۔ ادب انسان کے دل و دماغ میں ایک کھڑکی کا کردار ادا کرتا ہے جس کے ذریعے فرد اور سماج کے داخلی و خارجی معاملات و محرکات و اسباب کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

نفسیات اور ناسٹلجیا کا باہمی ربط گہرا ہے۔ ناسٹلجیا ایک پیچیدہ اور طاقت ور کیفیت کا مجموعہ اظہار ہے۔ ناسٹلجیا ماضی کے تجربات، مقامات اور لوگوں کی واضح یادوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو کہ بعض اوقات مثبت اور خوش گوار جذبات و احساسات سے جڑا ہوتا ہے۔ اس میں ایک تلخ حقیقت بھی ہے جو کہ اداسی یا حسرت سے جڑی ہوتی ہے۔ ماہرین نے ناسٹلجیا کو نفسیات کی ایک شاخ بتایا ہے۔ ناسٹلجیائی کیفیت میں نفسیاتی و ذہنی بیماری کی تشخیص کی گئی ہے۔ اس لیے ناسٹلجیا کی کیفیت کو اول اول ماہر نفسیات دان ہوفر نے ایک نفسیاتی مرض قرار دیا۔ نفسیات انسانی دماغ کا سائنسی مطالعہ ہے۔ لوگ کیسے سوچتے ہیں؟ لوگوں کے عمل اور رد عمل کے پس پردہ محرکات کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ نفسیات ان سوالات کو سمجھنے کا ایک فریم ورک مہیا کرتا ہے۔ یادداشت اور ناسٹلجیا کے باہمی تعلق سے نفسیات اور نفسیاتی مباحث کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ نفساتی عناصر کی تلاش و تعین ناسٹلجیائی رجحان کے علمی اور جذباتی بصیرت کا محاکمہ کرتی ہے۔ ناسٹلجیا انسانی صحت و مزاج پر مثبت اثرات رکھتا ہے خصوصی طور پر سماجی تعلقات میں

ایک دوسرے سے تعلقات اور احساس کی صورت میں یہ ایک خوشگوار لمحات کو فروغ دیتا ہے۔ناسٹلجیائی رجحان میں کوئی انسان اپنے ماضی اور بچپن کی یادوں کو یاد کر کے ایک سکون اور راحت محسوس کرتا ہے۔اطمینان اور تسلی کے محسوسات کی یہ اعلیٰ سطح ہوتی ہے۔دوست، احباب اور خاندان کے لوگوں کو یاد کرتے ہوئے افسردگی اور اضطراب کی سطح ہو جاتی ہے۔ناسٹلجیا سماجی رابطے کے جذبات و احساسات میں معاون ثابت ہوتا ہے لیکن ناسٹلجیا کے صحت و مزاج پر منفی اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔اس لیے بعض جگہوں پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ناسٹلجک (Nostalgic) ہے۔حال سے فرار ہونے اور درپیش مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اور ذہنی راحت کے لیے اگر کوئی شخص ماضی میں جاتا ہے تو یہ ایک قسم کی فراریت کے زمرے آئے گا۔موجودہ مسائل سے منہ موڑنا، آنکھیں بند کرنااور انسانی سماج کے نشیب و فراز کا سامنا کیے بغیر ماضی پر اس قدر مستحکم ہونا کہ حال کی پرواہ کرنا چھوڑ دیا تو ایسے میں یہ ناسٹلجیا ایک منفی عمل کی عکاسی کرتا ہے۔ماضی سے اس قدر مطمئن ہو کر اپنی زندگی میں آگے بڑھنے سے قاصر ہونا ایک ندامت کا سبب بنتا ہے۔حال سے لطف اندوزی اور اس کی نوعیت و اہمیت سے آنکھیں بند کرنا ناسٹلجیا کا منفی پہلو ثابت ہو سکتا ہے۔نفسیات اور ناسٹلجیا کے درمیان باہمی ربط کثیر الجہتی ہے۔اگر دیکھا جائے تو ناسٹلجیا کے دماغی صحت اور انسانی شخصیت پر مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں لیکن منفی جذبات و احساسات سے نمٹنے کی حکمت عملی کا ذریعہ بھی ناسٹلجیا کے امکانات و تشریحی انداز ہے۔ناسٹلجیا کے امکانات کو بروئے کار لاتے ہوئے فن پاروں کی تشریح و توضیح ہو سکتی ہے۔

اکیسویں صدی کا آغاز سیاسی و سماجی انتشار سے ہوتا ہے۔نائن الیون کا واقعہ پیش آتا ہے جس کے اثرات سے پوری دنیا متاثر ہوتی ہے۔اس سے عالمی و قومی منظر نامے اور ادب کے موضوعات پر اثر پڑتا ہے۔ان حالات و واقعات نے شدت پسندی، تشدد اور دہشتگردی کو فروغ دیا۔اس غیر یقینی صورت حال نے کئی ممالک عراق، افغانستان، لیبیا اور پاکستان سمیت دوسرے ممالک کو بیرونی اور اندرونی جنگ میں دھکیل دیا۔مشینی دور، گلوبلائزیشن، جدید اور قدیم کا ذہنی تصادم، نئی تہذیب اور پرانی تہذیب کا تصادم، انسانیت سوز واقعات، موبائل فون، انٹرنیٹ کا کثرت سے استعمال، عوام کا سیاسی استحصال، جنسی ہیجان، ہم جنس پرستی، مسلکی و لسانی، ملکی، نسلی اور علاقائی تعصبات، تغیرات اور جوہری ہتھیاروں کی نمائش یہاں تک کہ تیسری عالمی جنگ کے خطرات میں انسان کو ان مسائل سے دوچار کر دیا۔ان سماجی و سیاسی عوامل نے دنیا میں خوف، عدم برداشت، بیگانگی، بے حسی، عدم تحفظ، عدم شناخت اور سماجی گھٹن جیسے

دیگر سماجی و نفسیاتی مسائل کی صورت اختیار کی۔ اردو ادب میں ان سماجی و نفسیاتی اور سیاسی عوامل نے اپنا کردار ادا کیا۔ اردو طنز و مزاح میں اس صدی کے سماجی و نفسیاتی منظر نامے سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اکیسویں صدی کے طنز و مزاح میں نفسیاتی و سماجی رجحانات کی بہتات ہے۔ نفسیات اور ادب کا ربط گہرا ہے۔ کسی تحریر کے پس پردہ محرک نفسیاتی رجحان ہوتا ہے۔ ادب میں فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کے نظریات نے ہل چل مچا دی ہے۔ ادب میں نفسیاتی رجحانات، نفسی کیفیات، اسلوب اور تکنیک میں علم نفسیات سے استفادہ کیا ہے۔ نفسیات کی اصطلاحات اور نئے نظریات ورجحانات جیسے تحلیل نفسی، شعور، لاشعور، اجتماعی لاشعور، احساس کمتری، ناسٹلجیا، آر کی ٹائپ، آزاد تلازمہ خیال، ایڈی پس کمپلیکس، شعور کی رو، داخلیت، خارجیت، نرگسیت، وجودیت، اظہاریت اور خود کلامی وغیرہ شامل ہیں۔ ادیب نے اپنے معروض سے موضوعات کا چناؤ کیا۔ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کا اثر قبول کر کے تخلیقی عمل کو بروئے کار لایا۔

نفسیات کی چند تعریفیں:

دیوندر اسر "ادب اور نفسیات" میں لکھتے ہیں:

> "ادب اور نفسیات کے باہمی رشتے کو واضح کرنے کے لیے گوناگوں نظریات کے مطالعے اور تجزیے کی ضرورت آج بڑھ گئی ہے۔ ادبی مسائل پر بحث کے دوران میں سماجی، سیاسی، سائنسی، مذہبی اور اخلاقی نکات اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ جب بھی ادیب کی شخصیت اور اس کے تخلیقی عمل پر بات ہو گی۔ نفسیات کا ذکر ناگزیر ہو گا۔ انسان کا ہر شعوری عمل بنیادی طور پر اس کے ذہن سے وابستہ ہے۔ چنانچہ اس کے تخلیقی عمل کو سمجھنے، اس کی ذہنی ساخت اور اس کے ذہنی عمل کا مطالعہ ضروری ہے۔ علم نفسیات کے ذریعے ہم ادیب اس کی انفرادی اور مثالی (ٹائپ) حیثیت سے کرنے کے بعد اس کے تخلیقی عمل کے سرچشمے کا راز پاسکتے ہیں۔ اس طرح ہم جان سکتے ہیں اس کا تخلیقی عمل کس طرح پایہ تکمیل کو پہنچا ہے اور اس کا اظہار محسوس شکل میں کیوں ہوا۔"[1]

جیمز ولیم اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"Psychology is the sense of mental life, both of its phenomena and of their conditions. The phenomena are such thing, as we call feelings, desires, cognitions, reasoning and the like."[۲؎]

آل پورٹ ایف۔ ایچ اور مفلن نفسیات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"Social psychology is a discipline that uses scientific method to understand and explain how the thought, feeling and behavior of influenced by the actual, imagined presence of other human beings."[۳؎]

انسانی علوم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس نے انسانی شخصیت کے رازہائے سربستہ کھولنے کی کوشش نہ کی ہو۔ فنون لطیفہ، مصوری، سنگ تراشی، شاعری اور فلسفہ وغیرہ نے انسانی زندگی کی تہہ در تہہ پرتوں کو کنگھالا ہے۔ خصوصی طور پر علم نفسیات نے انسانی نشوونما کے زمانی اور مکانی، داخلی اور خارجی، شعوری اور لاشعوری ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ ادیب کا تعلق انسانی زندگی کی تہوں کو نمایاں کرنا ہے۔ اس لیے نفسیات اور ادب کا آپس میں کچھ تعلق گہری صورت اختیار کرتا ہے۔ ادبی فن پارہ انسانی ذہن کی کشمکش کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان میں انفرادی، شخصی، جنسی، جذباتی اور جمالیاتی احساس پوری طرح سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ کسی بھی تحریر یا شخصیت کی فکر میں نفسیاتی عناصر کا مطالعہ اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس میں انسانی شخصیت، تصور، آزادی تعمیریت، فردیت، سماجی و اقتصادی استحصال اور باطنی خواہشات کا واضح اظہار ملتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ فرد کی شخصیت، اظہار ذات اور اثبات ذات کو جاننے، پرکھنے کا ایک زاویہ بھی ہے۔ جس کے لیے کوئی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔

انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے۔ اس کی خصوصیت، اس کا شعور اور اس کے احساس و جذبات ہیں۔ انسان شعور کے ذریعے علم کو جانتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے علوم کو آگے بڑھانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے آگے کی جانب گامزن ہے۔ انسانی شعور کی وجہ سے اپنی ذات اور اپنے اردگرد کے متعلق سوچنے لگا۔ یہی مسائل اور امکانات بعد میں نفسیات کے بنیادی سوالات بن گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تلاش و تعین میں عقل، مشاہدے اور تجربے پر زور دیا جانے لگا۔

علم نفسیات میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے مفہوم میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔سایئکالوجی کی اصطلاح یونانی زبان سے ماخوذ ہے۔ یہ دو الفاظ کا مرکب ہے۔سائیکو معنی روح اور لوجی معنی علم۔ سایئکالوجی کا مطالعہ روح کا مطالعہ اکثر اس کو نفسیات کا مطالعہ کہا جاتا ہے۔بعد میں اس کو انسانی دماغ کا مطالعہ کہا گیا۔وقت کے ساتھ ساتھ علم نفسیات کی تعریفات میں تبدیلی آتی گئی۔نفسیات کو مطالعہ شعور (Study of consciousness) کا نام بھی دیا گیا۔اس کے زمرے میں نفسیاتی کیفیتیں اور افعال شامل ہیں۔لاشعور کے پہلو پر بعد میں جا کر الگ سے بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ جدید ماہرین نے (Study of human behavior) یعنی انسانی کردار کے مطالعہ سے پیش کیا گیا۔اس پہلو سے نفسیات کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔کردار سے صرف جسمانی افعال مراد نہیں بلکہ وہ افعال اور جسمانی بھی اس دائرہ میں جو آشکارا نہیں۔اس کا عمل اور رد عمل انسان کے باطن اور خارج میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔نفسیات سماجی علوم کی ایک شاخ ہے۔باقاعدہ سماجی سائنس کی ایک شاخ ہے۔ جس طرح سائنس کی بنیاد ٹھوس تجربے اور مشاہدے پر ہوتی ہے اسی طرح نفسیات میں بھی زندگی کے بنیادی مسائل کو مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں تلاش کیا۔

جدید نفسیات فرد کی ذات، اس کا انفرادی طریقہ کار، اس کے جذبات و احساسات، فکر ورجحان اور باطنی کیفیات کے تمام مسائل و امکانات کا جائزہ لیتا ہے۔یوں انسانی شخصیت کے تمام پہلو علم نفسیات کا مرکز بن گئے ہیں۔ادب اور نفسیات کا گہرا ربط ہے۔دونوں انسانی زندگی اور انسانی سماج کے تہہ در تہہ حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔کسی عمل یا واقعے کے پس پردہ محرکات، سیاسی وسماجی، تہذیبی واقتصادی عوامل کو بروئے کار لاکر تخلیق کرتے ہیں۔ادب اور فن پارے کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے جس میں جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ مشاہدات و تجربات بھی شامل ہوتے ہیں۔ادب کا تعلق انسان کے شعوری اور غیر شعوری عمل سے ہے۔اس کے داخلی اور خارجی خیالات وافکار کو فن کے پیکر میں سمو کر پیش کیا جاتا ہے۔ادب میں سماجی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کے ساتھ ساتھ انسانی شخصیت کے پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ادب اپنے عہد کی سماجی ناہمواری کی صرف نشاندہی کرتا ہے بلکہ ہر دور کے امکانات ومسائل کا عندیہ پیش کرتا ہے۔گزرے ہوئے حالات و واقعات کو صرف افسانوی یا شعری پیرائے میں لکھ کر دستاویز پیش نہیں کی جاتی ہے۔بلکہ مسائل کے پس پردہ سماجی ناہمواریوں کی طرف پڑھنے والے کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ادب میں سماج اور فرد کو اہمیت حاصل ہے۔سماجی شعور کی ترقی افراد پر منحصر ہے۔سماج اکائی ہے، سماج کل ہے۔اس کے اجزا میں تہذیبی و اقداری اجزا شامل ہیں۔جس سے مل کر ایک سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ادب اور

نفسیات فرد کی داخلی اور خارجی ماحول کو زیر بحث لاتے ہیں۔ادیب جس فضا میں سانس لیتا ہے اس عہد کے سیاسی و سماجی اور تہذیبی و اقتصادی حالات اس کی شخصیت اور اس کی فکر پر اثرانداز ہوتے ہیں۔نفسیات فرد کے جذبات و احساسات کے ساتھ انفرادی و اجتماعی شعور اور لاشعوری پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ایک سماجی عمل کے ذریعے اپنے معروض سے چیزوں اور واقعات کا ادراک ہی حقیقی معنوں میں سماج کی خدمت کا سہارا ہے۔واقعات، سانحات کے عمل اور رد عمل کی نفسیات کو جانچنے کا سلسلہ فرائیڈ سے لے کر ژونگ اور موجودہ دور کے ماہرین نفسیات کا موضوع ہے۔ادیب اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات اور سماجی منظر نامے کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔عالمی اور قومی سطح پر سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے اثرات سے محفوظ رہنا گو کہ مشکل ہے لیکن گلوبل ولیج کی صورت میں دنیا ایک دوسرے کے اثرات سے متاثر ہوتی ہے۔واقعات، سانحات کے نفسیاتی اثرات تا دیر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ نفسیاتی عناصر کی موجودگی ہر تحریر میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی ہے۔ محققین اور ناقدین کسی فن کار کی تحریروں کا نفسیاتی و سماجی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں۔ان نفسیاتی و سماجی عناصر کی موجودگی سے مصنف کی تحریر کے تناظر و زاویے کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ادیب گزرے ہوئے حالات و واقعات کی عکاسی نہیں کرتا ہے۔ انسانی زندگی ممکنات کا نام ہے۔ ادیب امکانات کا احاطہ کرتا ہے۔ان کی تحریروں میں سماجی موضوعات میں مختلف مکتب فکر کے زاویے پائے جاتے ہیں۔ان زاویوں کے ذریعے مصنف کی تحریروں کا مطالعہ کر کے تفہیم و تجزیہ کیا جاتا ہے۔ نفسیاتی تناظر کے ذریعے اخلاقی و اقداری روایات علوم اور مباحث کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ادب کے فن پاروں میں نفسیاتی عناصر کے ذریعے نئے مباحث کا آغاز ہوتا ہے۔فرد اور سماج کا تعلق اور فرد کا سماج سے تعلق کس نوعیت کا رہا ہے۔ فرد نے سماج سے اخذ کر کے تخلیق کی صورت میں کیا دیا ہے؟ادیب اپنی تحریروں کے موضوعات کا چناؤ سماج سے کرتا ہے۔اس طرح ان کی تحریروں کا مختلف زاویوں سے مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ادیب نے اپنے عہد اور آنے والے عہد کے کن کوششوں کو زیر بحث لایا ہے۔ ان کے ہاں سماجی و ادبی اور علمی موضوعات پر مکالمے کی نوعیت اور گنجائش کیا رہی ہے؟ ان کی تحریروں میں نفسیاتی، سیاسی اور سماجی عناصر کے ذریعے اخلاقی اقداروں کو اجاگر کیا گیا ہے؟ یہ ایک زاویہ فکر ہے جس کے ذریعے فن پاروں کی پرکھ کی جاتی ہے۔

معاصر ادب نفسیات کے نئے نظریات کی روشنی میں فرد اور اس کے ذہنی عمل میں زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے۔ادب میں ایک مخصوص نظریہ تو کردار کی ذہنی کیفیت کے بیان کو اپنا مقصود سمجھتا ہے۔اکثر اوقات فرد اس کی ذہنی کیفیت اور

اس کی لاشعوری قوت کے گونا گوں تجربات کا بیان ملتا ہے۔ ادب میں ان رجحانات و فکری مباحث کا باعث فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کے نظریات ہیں لیکن یہ کہنا مناسب نہیں ہو گا کہ فلاں ادیب فرائیڈ پرست ہے فلاں ژونگ پرست، فلاں ماضی پرست، قدامت پرست۔ یہ ممکنات میں ہے کہ ادیب کی تخلیقات میں کم و بیش ان تمام نظریات کی آمیزش ملتی ہے۔ ایک ادیب اپنے ادب کی مبادیات نظریات سے زیادہ افراد پر رکھتا ہے۔ کسی خالص نظریے یا فکر کی عکاسی کو صحافتی ذریعہ ابلاغ کہا جاتا ہے۔ ادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادیب کی تحریر میں اپنے عہد کے حالات وواقعات اور امکانات کی جھلک ہوتی ہے۔ یہ کسی مخصوص مکتبہ فکر کی جاگیر نہیں ہوتی بلکہ پڑھنے اور سمجھنے والوں کی پراپرٹی ہوتی ہے۔

ادبی تخلیق میں نفسیاتی عناصر اور نقطہ نظر کو کیا مقام حاصل ہے، ادیب داخلی یا خارجی محرکات سے محسوسات اخذ کرتا ہے۔ ان کو کس طرح فن کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور پھر کیسے انہیں خارجی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس کے محسوسات کا خارجی اظہار دوسرے ادیبوں کے خارجی اظہار سے کیوں مختلف ہو سکتا ہے۔ ادیب اپنی تخلیق سے کیوں اور کس طرح قارئین پر اثر انداز ہوتا ہے؟ ان تمام تر سوالات کا احاطہ ادب اور نفسیات کے باہمی مطالعے سے سامنے آتا ہے۔ ادیب کے ہاں برتنے والے موضوعات کی نوعیت دیگر ادیبوں سے مختلف ہونے کے پیمانے نفسیاتی و سماجی مطالعے کے سبب ممکن ہے۔ اس سے ادب اور نفسیات کے مطالعے کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کہا جاتا ہے۔ مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ ادیب کی تحریر میں پختگی اور سنجیدگی لاتا ہے۔ صاحب مطالعہ شخص کو تحلیل نفسی کی رو سے مطالعہ کیا جائے تو ایک طرح سے مطالعہ حقیقی تسکین کا بدل ہے۔ پڑھتے لکھتے ہوئے انسان کا کتھارسس ہوتا ہے۔ مظلوم کردار، واقعات، خوشی، غم کے تاثرات سے انسان کے رویوں میں تبدیلی آتی ہے۔ ادیب ان نفسیاتی، سیاسی و سماجی عناصر کو سنجیدگی سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ ایک ماہر ادیب لکھاری تمام واقعات کا بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا ہے۔ وہ قاری یا پڑھنے والے کے تخیل کے لیے بھی کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ قاری اپنے ذہنی میلان یا ارد گرد کے مطابق مفہوم اخذ کر سکیں۔ دوران مطالعہ پڑھنے والا اپنے آپ کو کرداروں اور واقعات سے مماثلت دیتا ہے، ان سے ہمدردی اور غصے کے جذبات جتاتا ہے۔ یہ عمل یا ردعمل شعوری اور لاشعوری ہو سکتا ہے۔ افسانوی ادب، شاعری اور مزاح کی کتب پڑھتے ہوئے ان حالات و واقعات کا سامنا قاری کو ہوتا ہے۔ اس طرح نفسیات اور ادب کے

مطالعے سے ان فکری رجحانات و افکار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کسی تخلیق کے پیچھے دو محرکات ہوتے ہیں معاشی و سماجی اور نفسیاتی عوامل، یعنی کہ ذاتی افکار خیالات، احساسات اور جذبات۔

معاشی اور ذاتی افکار خیالات و احساسات سے کوئی فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ لکھنے کا محرک ہی دو عوامل ہو سکتے ہیں۔ ادبی تخلیقات سے متعلق بے شمار نظریات، تصورات اور مکاتب فکر وجود میں آئے ہیں جس کے تناظر میں تخلیقی فن پاروں کی تفہیم و تشریح اور تجزیے کیے گئے ہیں۔ ان تصورات و نظریات میں نفسیاتی اور ناسٹلجیائی بھی ایک زاویہ فکر ہے جس کے ذریعے ادب تخلیق کیا گیا ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان جو کہ دبستان نفسیات کی ایک شاخ سمجھی جاتی ہے۔ اس رجحان کے تحت قیام پاکستان کے بعد ادب تخلیق ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد فن پاروں کا مطالعہ ناسٹلجیائی رجحان کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ ہجرت، ماضی کی یادوں کو تخلیق کاروں نے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ماضی کی یاد کے ذریعے سماجی و اخلاقی اقدار کو یاد کیا گیا۔ اس رجحان کے تحت لکھی گئی تخلیقات کو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

ناسٹلجیا بنیادی طور پر ماضی کی یادوں میں گم رہنے کا نام ہے یعنی اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ ناسٹلجیا کی ممکنہ طور پر تین حالتیں ہو سکتی ہیں زمانی ناسٹلجیا، زمینی ناسٹلجیا اور شخصی ناسٹلجیا۔ زمانی ناسٹلجیا میں مبتلا شخص اپنی زندگی کے گزرے ہوئے حسین اور خوش گوار لمحات کی یاد میں ہر وقت محو رہتا ہے۔ زمینی ناسٹلجیا میں مبتلا شخص کو اس خطے اور علاقے یا قطع زمین کی یاد ہر وقت ستاتی رہتی ہے۔ جہاں اس کی زندگی اس کی سوچ کے مطابق بہتر اور بھرپور انداز میں گزری ہو۔ شخصی ناسٹلجیا سے مراد یہ ہے کہ جب شخصیت یا شخصیات کے ساتھ گزرے لمحوں اور ان سے ہونے والی محبت سے کسی انسان کا چھٹکارا پانا مشکل ہو جائے ہر لمحہ اور ہر وقت اسی کے ساتھ گزرے وقتوں کی یاد آوری دل و دماغ پر بیماری کی طرح حاوی ہو جائے۔ ناسٹلجیا کی یہ تین حالتیں اور کیفیات اس رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔

ناسٹلجیا کا لفظ دو یونانی الفاظ "Nostos" واپسی اور "Algos" درد کے باہمی اشتراک سے بنا ہے۔ لفظ ناسٹلجیا کو با قاعدہ اصطلاح کے طور پر ہوفر نے استعمال کیا۔ ملک واپسی کے زمرے میں، گھر بار کی یاد میں، کسی جنگ یا محاذ سے فوجی سپاہیوں کے لیے یہ اصطلاح ان کی کیفیات و محسوسات کے لیے استعمال کی گئی۔ شروع شروع میں علم نفسیات کی یہ اصطلاح ایک نفسیاتی و ذہنی امراض و خلل میں مبتلا مریضوں کے علاج و معالجے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ یہ

ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ انسان حال اور مستقبل کی پرواہ کرنا چھوڑ کر ماضی میں پناہ لیتا ہے۔یعنی کہ ناسٹلجیا گزرے وقت کی تاریخ ہے۔ناسٹلجیا حال اور ماضی کے مابین یک طرفہ مکالمہ ہے جس میں ماضی حال پر حاوی ہو کر حال کو ماضی کے حالات وواقعات پر آمادہ کرتا ہے۔ممکنات میں ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے ابتدائی زمانہ (بچپن) اور جوانی کے معاشرتی اور جغرافیائی ماحول سے وجودی طور پر دور رکھا جائے تو ان حالات وواقعات سے جو خلا اور فضا جنم لیتی ہے وہ ناسٹلجیائی کیفیت کی ترجمان ہوگی۔ناسٹلجیا کو ہوفر نے استعمال کیا۔تقریباً یہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بیماری کے طور پر استعمال ہوئی اور اس کا پس منظر سوئس فوجیوں کی وطن واپسی کی خواہش اور گھر بار کی یاد کا تناظر بتایا گیا ہے۔پردیس میں انسان کو فطری طور پر اپنا وہ علاقہ ،گھر وغیرہ یاد آتا ہے تو طبیعت و مزاج میں ایک بوجھل سی تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔اس طرح ناسٹلجیا کو ابتدا میں ایک بیماری کے طور پر استعمال کیا گیا شدت سے اپنے وطن اور گھر کی یاد کے زمرے میں۔

کیمبرج انگلش ڈکشنری میں ناسٹلجیا کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> "a feeling of pleasure and also a slight sadness when you think about things that happened in the past."[۴]

وہ احساس جس میں خوشی اور اداسی کی آمیزش ہو جب ماضی کے حالات وواقعات کو یاد کر کے حال کی سختی یا تلخی ماضی کو یاد کرنے سے کم محسوس ہوتی ہے۔بعض لوگ اس کیفیت یا لمحات کو قدر زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔آن لائن انگریزی سے اردو ڈکشنری میں یہ بیان ہوتا ہے کہ "ماضی کی حسرت ناک یادیں،ماضی کی یاد دلانے والی اشیاء اور گھر کی یاد۔۔۔"[۵]

ناسٹلجیا کے متعلق چند مزید آرا پیش خدمت ہیں:

اربن ڈکشنری کے مطابق:

> "a bitter sweet longing for things, persons or situations of the past."[۶]

ماضی سے وابستہ چیزیں یا حالات جس سے نجات ممکن نہ ہو۔

پریکٹیکل ڈکشنری میں ناسٹلجیا کے متعلق بیان ہوتا ہے:

"Nostalgia describes a longing for the past often in idealized from nostalgia may or may not also be known as home sickness."[۷]

جوہانسس ہوفر نے ناسٹلجیا کی اصطلاح جب استعمال کی تو اس کے متعلق جوزف بنکس نے کہا:

"By 1850s nostalgia was losing its as a particular disease and coming to be seen rather in 1st and 2nd world war still being recognized."[۸]

ڈاکٹر قاضی جاوید ناسٹلجیا کے متعلق لکھتے ہیں:

"بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورت حال کی ناخوش گواری کا مداوا کر سکیں۔"[۹]

مشتاق احمد یوسفی ناسٹلجیائی رجحان کے متعلق لکھتے ہیں:

"جب انسان کو ماضی، حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جوانی لیوا حملہ کسی بھی عمر بالخصوص بھری جوانی میں ہو سکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروئن دستیاب نہ ہوں تو پھر اسے یادِ ماضی اور فینٹیسی میں، جو تھکے ہاروں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ ایک گونہ سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔۔۔ کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے جو قوم جتنی پس ماندہ، درماندہ اور پست حوصلہ ہو اس کو اپنا ماضی معکوس اقلیدسی تناسب (inverse geometrical ratio) میں اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار و ابتلا کی گھڑی میں اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتاً تھا بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سرِ نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے۔۔۔ ماضی تمنائی"[۱۰]

ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے گئے ادب کا مطالعہ کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ہجرت، ماضی پرستی، زمین سے بے دخلی، ایک تہذیبی اقدار اور روایات سے کٹ کر نئے ماحول اور نئی سرزمین پر دکھوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنا گزرا ہوا عہد یاد رکھنا۔ ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے گئے فن پاروں میں ہجرت کے بعد معاشرہ دکھایا گیا ہے کہ ہجرت کے وقت فسادات اور غیر انسانی سلوک کے بعد جب یہ زندہ پہنچتے ہیں تو ان کو اپنی ہجرت کرنے پر افسوس کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ اخلاقی اقدار کی پامالی، اس کے ساتھ ہونے والے سلوک اور برتاؤ کے سبب اپنے گزرے ہوئے عہد اور وقت کی قدر سامنے آتی ہے۔ ناسٹلجیا کے محرکات میں معاشی صورت حال، ہجرت، اخلاقی اقدار کی پامالی، تہذیبی بحران اور نئے نظام حیات میں عدم توازن ایسے میں نفسیاتی عوامل ناسٹلجیا کا سبب بنتے ہیں۔ ناسٹلجیائی کیفیت کے عناصر اردو ادب کی ہر صنف میں دیکھے جاسکتے ہیں، انسان کسی بھی عمر میں ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ ماضی صرف گزرے ہوئے دنوں کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ماضی ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ جس کو سامنے رکھ کر انسان مستقبل کو بہتر کر سکتا ہے۔ ماضی کی غلطیوں سے کوتاہیوں سے سبق حاصل کر کے ایک بہترین معیاری نظام حیات اور سماج تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ انسانی رویوں کو متوازن اور معتدل رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بے ضابطگی اور توازن کے بگڑنے سے بڑے سماج کا نظام بھی درہم برہم ہو سکتا ہے۔ انسانی جذبات، احساسات اور رویوں میں توازن کو برقرار رکھ کر ماضی حال اور مستقبل کو مثالی بنایا جاسکتا ہے۔ ماضی کی تکنیک کو بیماری کے بجائے خوش گوار احساس مٹتی اور مرتی ہوئی تہذیبوں کو اجاگر کیا جائے۔ ناسٹلجیا کے ذریعے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی مسائل جیسے اخلاقی سطح کا دیوالیہ پن، ماضی کی بازیافت، اقدار و روایات کی پامالی اور زوال آمادگی کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ انسان دوستی اور عظمت انسان اور انسان کی بے توقیری کا بیان ناسٹلجیا کے ذریعے ممکن ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ناسٹلجیائی رجحان کے تحت جو افسانوی اور غیر افسانوی ادب لکھا گیا ہے وہ صرف ماضی کے واقعات کو کسی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ جو کہ تاریخ، صحافت اور تاریخی دستاویز کی صورت اختیار کرتی ہے۔ ناسٹلجیا کے ذریعے صرف ماضی کی روایات اور اخلاقی اقدار کی پامالی کا رونا دھونا نہیں ہوتا بلکہ اس رجحان ساز تکنیک کے ذریعے مرتی ہوئی تہذیب و اخلاقیات کا ایک عکس پیش کیا جاتا ہے جس سے حال کو بہتر کیا جا سکتا ہے۔ امکانات و مسائل کی نشاندہی کے سبب ماضی کی پرتیں سامنے لائی جاسکتی ہیں۔ انسانی زندگی کا ایک بڑا حصہ ماضی کی یادوں پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ ماضی کا حصہ بنتا ہے۔ ادب دوسروں کے تجربات و مشاہدات کا نام ہے۔ ماضی کو صرف اس بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ گئے دور کی داستان ہے۔ انسانی

زندگی کا تجربہ ماضی ہے۔ دنیا کا بڑا ادب ماضی پر مشتمل ہے۔ ماضی سے قوت کشید کی جاسکتی ہے حال انسان کے قابو میں نہیں۔ ہر گزرتا لمحہ ماضی میں جا کر جذب ہوسکتا ہے۔ مستقبل پر انسان کو قابو نہیں ہے۔ مستقبل کے متعلق صرف پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ ماضی کو صرف یہ کہہ کر نظر انداز کرنا کہ یہ صرف گزرے ہوئے واقعات ہیں اس وسیع تجربے سے لکھا گیا فن پارہ اپنے موجودہ عہد کے موضوعات و مسائل کا عکاس ہوتا ہے۔ ماضی کی ایک حد سے زیادہ تکرار ایک نفسیاتی بیماری کی صورت تب اختیار کرتی ہے جب آدمی حال اور مستقبل سے اپنا ربط جزوی بناتا ہے۔ دنیا بھر میں لکھا گیا ادب ماضی کی ایک بڑی مثال ہے۔ جس کے ذریعے قومی واقعات، سانحات، انقلابات اور رد انقلابات کے سیاسی و سماجی اور نفسیاتی عناصر کا تجزیہ یہ پہلو پیش کرتا ہے کہ ناسٹلجیائی رجحان کے تحت ایک انفرادی تجربہ جو کہ فن پارے کی صورت میں آیا ہے اس سے آنے والے عہد میں دور دراز تک لوگ کس قدر استفادہ کرتے ہیں یا کرسکتے ہیں۔ آج روسی، جرمن اور فرانسیسی فن پاروں کے تراجم کو پڑھا جائے تو اس میں ماضی کے واقعات اور حالات کا بیان صرف نہیں بلکہ اس ناسٹلجیائی رجحان کے ذریعے معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہوتا ہے۔ ناسٹلجیا ماضی کی بازیافت کرتا ہے۔

ناسٹلجیا کی تین صورتیں جو کہ زیادہ تر زیر بحث آتی ہیں

۱۔ وطن واپسی کی خواہش یا تمنا

۲۔ نفسیاتی بیماری

۳۔ یادِ ماضی

وطن واپسی کی خواہش یا تمنا کا اظہار ہوفر نے سوئس فوجیوں کے حوالے سے کیا ہے کہ دوسرے ملک میں مسافر شخص کو اپنے وطن کی یاد آتی ہے تو لاشعوری طور پر ایک تڑپ محسوس کرتا ہے اس کیفیت کو ناسٹلجیا کی ابتدائی صورت کہا جاتا ہے۔

نفسیاتی بیماری کے طور پر کہا جاتا ہے کہ انسانی رویوں، جذبات واحساسات میں جب توازن بگڑ تا ہے تو ماضی کی یادیں انسان کو نارمل رہنے نہیں دیتیں۔ حال اور مستقبل سے زیادہ ماضی کے جھروکوں میں رہنا ایک قسم کی ماضی پرستی ہے جو کہ انسانی سماج میں ایک مسئلے کا سبب بنتی ہے۔

یادِماضی وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے کچھ لوگوں کے لیے اس حقیقت کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ارد گرد کی صورت حال ہمارے ماضی سے بالکل مختلف تھی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ماضی ہماری یادوں میں زندہ رہتا ہے۔ کبھی خوش گوار اور کبھی دل کو بوجھل کرنے والا۔ لیکن دنیا ترقی کر رہی ہے اس کی روایات اور اخلاقیات بدل رہی ہے لیکن ایسے میں ماضی کے ساتھ چمٹ کر رہنا، یادوں کے سہارے زیست کرنا، جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماضی انفرادی سطح اور قومی سطح پر تعمیری پہلو اور تخریبی پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ قوموں کی اجتماعی تاریخ میں ماضی ایک اہم پہلو ہے جس سے قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ دیگر اقوام کے ساتھ مقابلے کے امتحان میں ایک قوم بن کر سامنے آتی ہے، ناسٹلجیا میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ میں اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔"[11]

ناسٹلجیا کی کیفیت کو فروغ دینے میں ہجرت، تلاش معاش، ملک شہر اور دیہات سے دوری بھی ہے۔ گو کہ یہ خود اختیار کردہ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اپنوں سے دوری کے سبب اپنے گھر، اپنوں کی یاد انسان کو ناسٹلجیائی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ عصری صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو بیرونی ممالک جا کر روز گار، رہائش اور وہاں دیگر سماجی مسائل کی صورت میں اپنے وطن کی یاد اور اپنے وطن کی تڑپ دل میں ایک کسک کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ ممالک کی سیاسی وسماجی تبدیلیوں کی وجہ سے بیرونی ممالک کے رہائشیوں کے مسائل بدل جاتے ہیں۔ یہ ناسٹلیائی کیفیت کا تناظر عالمی اور مقامی لوگوں کے جذبات واحساسات کو بدلتے ہیں۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ نائن الیون واقعے کے بعد پاکستانیوں کو کس قدر معاشی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں ملک بھر میں خصوصاً خیبر پختونخواہ کے لوگوں کو نقل مکانی اور ہجرت کرنی پڑی۔ نائن الیون سے پیدا ہونے والے حالات نے مقامی لوگوں کے نفسیاتی و سماجی مسائل میں اضافہ کرتے ہوئے ان کے نفسیاتی اور ناسٹلجیائی کیفیت میں اضافہ کیا۔ سوات آپریشن

۲۰۰۹ء کے وقت راقم نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ عالمی سیاست اور عالمی دنیا میں نائن الیون سے براہ راست پاکستانی معاشرہ خصوصاً خیبر پختونخواہ کے رہائشی متاثر ہوتے ہیں۔ چار سے پانچ ماہ کے لیے مالاکنڈ دویژن سے مردان، صوابی، پشاور اور اسلام آباد وغیرہ ہجرت کرنی پڑی۔ اس دوران اپنے علاقے، گھر اور ماحول کی یاد نے لوگوں کو ناسٹلجیائی کیفیت میں مبتلا رکھا۔ ایسے حالات میں ناسٹلجیائی کیفیت کا در آجانا فطری ہوتا ہے کہ نئے علاقے میں رہائش اختیار کرتے ہوئے جن سماجی و نفسیاتی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ آدمی کو یہ باور کراتا ہے کہ گزرا ہوا وقت سنہرا تھا۔ اس کو یاد کرتے آنکھ نم ہوتی ہے اور پرانی یادوں کو یاد کرتے ہوئے حال کی تلخی میں کمی کا احساس محسوس ہوتا ہے۔ آپریشن مالاکنڈ کے دوران ایک شعر یاد آتا تھا جو کہ ناسٹلجیائی کیفیت کا اظہار ہے:

گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں

شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

ناسٹلجیائی کیفیت اور ناسٹلجیائی رجحان کو فروغ دینے میں ہجرت گھر کی یاد کے ساتھ ساتھ نئے علاقے میں سہولیات زندگی سے محرومی بھی ناسٹلجیائی کیفیت میں مبتلا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

ناسٹلجیائی رجحان کو فروغ دینے میں کسی بڑی تہذیب کی زوال آمادگی یا کسی آدرش نظریے کی شکست وریخت بھی ایک محرک بنتا ہے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ جیسا کہ ۱۹۴۷ء تقسیم ہند، سقوط ڈھاکہ، سوویت یونین کے زوال اور نائن الیون کے بعد آدرشیوں کی حالت میں ناسٹلجیائی رجحانات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک تہذیبی تاریخی صورت میں انسان اپنے سے منسلک رہتا ہے اچانک لاتعلقی کی وجہ سے انسان کا ایک عرصے تک ماضی کے سحر میں رہنا فطری عمل ہے۔ اس ناسٹلجیائی رجحان کے تحت انتظار حسین، قراۃ العین حیدر اور ناصر کاظمی اہم حوالے ہیں۔ ہجرت کے کرب نے جن ادبا اور سماجی دانش وروں کو براہ راست متاثر کیا ہے اس کا اظہار تخلیقی فن پاروں میں شدت سے دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔ احمد مشتاق کا ایک شعر اس کی وضاحت کے لیے:

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے

اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

انسانی زندگی مختلف رجحانات، تحریکوں اور فکری جہات کا مجموعہ ہوتی ہے۔انسانی زندگی اور سماج سے متعلق انسانی رویے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر شخص ان مختلف رویوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ تخلیق کار کے ہاں مختلف نظریے اور نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ناسٹلجیا کا رجحان کسی شخص میں کسی بھی عمر میں نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ شدت سے اس رحجان اور کیفیت کا شکار ہو کر اس کا اظہار کرتے ہیں کچھ نہیں کرتے لیکن ان کیفیات کا در آنا فطری بتایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم پرویز لکھتے ہیں:

> "ناسٹلجیا ایسی چیز ہے جس سے کسی انسان کو مفر نہیں اس کے لیے کسی خاص ذہنی سطح کی قید بھی نہیں یہ کم و بیش ہر شخص کا مقدر ہے خواہ وہ کوئی دانش ور ہو یا عام آدمی۔ ہاں فرد واحد کے ہاں اس کے درجات مختلف ہوسکتے ہیں اس کے انفرادی جذبات اور احساسات کے تعلق سے۔ ناسٹلجیا کی ایک عام سطح تو ماضی کی یادیں ہیں۔ اس لیے کچھ اوپر کی سطح کچھ لوگوں کے ہاں اپنے ماضی میں جینے کا رجحان ہے جسے انگریزی میں (living in one's past) کہا جاتا ہے۔"[۱۲]

ناسٹلجیائی رجحان کے پس منظر میں تہذیبی، اقداری، سیاسی و سماجی اور رومانوی عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ رومانوی فضا میں آدمی ماضی کی سنہری یادوں میں جاتا ہے۔ ماضی کی بازیافت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ماضی کے جھروکوں سے حال میں آسودگی محسوس کرتا ہے۔ دوسری جانب سیاسی و سماجی عدم توازن اور تہذیبی اقدار کے زوال کے وقت میں آدمی ماضی کی روایات اور اقدار کا موجودہ عہد کے ساتھ تقابل کرتا ہے۔ ایسے میں حال کی تلخی اور گھٹن سہنے اور محسوس کرنے میں کمی کا احساس محسوس ہوتا ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان کے تحت کسی بھی سماج کے تہذیبی، نفسیاتی اور سماجی موضوعات کی بازیافت ممکن ہوتی ہے۔ اس حوالے سے عاصم بٹ لکھتے ہیں:

> "ناسٹلجیا خود کو دہرانے کی خواہش کا نام ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ ماضی سے مراد اپنا وہ سب کچھ جو ہو چکا ہے اور وہ سب کچھ جو پہلے سمجھا اس کی طرف لوٹنے کی خواہش ناسٹلجیا ہے۔"[۱۳]

دیکھا جائے تو ناسٹلجیائی رجحان ماضی کی بازیافت، تہذیبی اقدار کی پامالی اور انسانی یادوں کو دہرانے کا متقاضی زاویہ ہے۔ کوئی شخص کہیں بھی جائے تو وہ اپنے آبائی علاقے اور جگہ سے کٹ نہیں سکتا۔ ایک عرصے بعد جا کر آدمی کے دل میں کسک سی پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہاں جا کر دیکھتا ہے تو آدمی کی عجیب و غریب حالت ہوتی ہے۔ آدمی کے سامنے

دھندلی دھندلی سی تصویریں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ آدمی چند سیکنڈ میں ماضی کے ان جھروکوں میں پہنچتا ہے جہاں سے نکلے چار دہائیاں گزر چکی ہوتی ہیں۔ اس عجیب سے محسوسات کو ناسٹلجیا قید کر کے تحریر میں لاتا ہے۔ اس حوالے سے احمد سہیل لکھتے ہیں:

> "ناسٹلجیا کا مفہوم ہمارے یہاں "خانہ اداسی" سے لیا جاتا ہے جو یکسر غلط ہے خانہ اداسی سے مراد (home sickness) ہے۔ یہ کہ ناسٹلجیا جو بظاہر لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے حقیقتاً دو یونانی الفاظ "Notos" بمعنی واپسی اور "algos" بمعنی درد کے ہیں سے مل کر بنتا ہے۔ لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی "درد آلود واپسی" ہوگا۔"[۳۱]

ناسٹلجیائی رجحان مربوط زاویہ فکر کے ساتھ اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔ یہ انسان کے جذبات و احساسات اور مشاہدات و تجربات سے وابستہ ہو کر انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ کسی تحریر میں ناسٹلجیائی رجحان کے محرکات میں عصری، سیاسی و سماجی صورت حال، عصر کی تلخی، سکون و راحت کی تلاش، تہذیبی روایات، اخلاقی اقدار کی پامالی، انسان کی بے توقیری، فرد کے داخلی و خارجی معاملات میں کشمکش اور انتشار کے سبب ذہنی خلل اور ناسٹلجیائی کیفیت کا اظہار سامنے آتا ہے۔

یادیں انتہائی پراسرار انداز میں انسانی زندگی کی خالی جگہوں کو پر کرتی ہیں۔ اگر یادوں کی فصل کو کیڑا لگ جائے تو انسانی زندگی اپنے خوبصورت عنصر کی عدم موجودگی کے صدمے سے نڈھال ہو جاتی ہے اور محبت و انس کا پھول مرجھا جاتا ہے۔ یادوں سے خالی فضا میں لاتعلقی کی بے رحم آندھیاں، شاندار انسانی جذبوں کو خزاں رسیدہ پتوں کی مانند اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتی ہیں۔ شاید بہت کم لوگوں کو اس بات کا احساس ہوگا کہ آج کل کی ڈیجیٹل فضا یادیں پالنے کے لیے انتہائی ناسازگار ہے اور یادیں بھی مسلسل مرتی جا رہی ہیں۔ یادوں کی بے وقت موت سے زندگی کے حسین تسلسل کو خطرات درپیش ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے اس حقیقت کو قبول کرنا مشکل بھی ہوتا ہے۔ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمارے ارد گرد کی صورت حال اس سے مختلف تھیں جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ماضی ہماری یادوں میں زندہ رہتا ہے۔ کبھی خوش گوار تو کبھی دل کو بوجھل کرنے والا! لیکن دنیا تو ترقی کر رہی ہے یا پھر آگے بڑھ رہی ہے۔ یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ دنیا تبدیل ہو رہی ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ چلنا تو ہے خواہ اس کا تعلق

معاشرے کی اخلاقی اقدار سے ہو، رہن سہن، سیاسی، ثقافتی معیار سے ہو، جغرافیائی صورت حال، سوچ، انداز فکر، میل جول اور تعلیم و تربیت ہر چیز اور ہر جگہ سماجی تبدیلی کا عمل جاری ہے۔یوں تو حالات کی تبدیلی پر گھبرانا نہیں چاہیے،وقت بدلنے کے لیے ہوتا ہے اور وقت بدلنے سے حالات بھی۔لیکن رویوں کی تبدیلی سے ایک انجاناساڈر جنم لیتا ہے۔یہ رویے جب اجتماعی صورت حال اختیار کرتے ہیں تو انسانی سماج جب اجتماعی صورت اختیار کرتے ہیں تو انسانی سماج کے لیے زوال آمادگی کے اسباب بنتے ہیں۔وقت گزرتا ضرور ہے مگر واپس نہیں آتا۔یہ گزرتا وقت بیکار بھی نہیں۔تاریخ، ادب اور ماضی انسانی زندگی کے تجربے اور انسانی سماج کو سمجھنے پرکھنے کے لیے ایک قابل یقین دستاویز ہے۔اجتماعی رویوں کے بدلنے کے محرکات کا مطالعہ ناسٹلجیائی اور نفسیاتی مطالعے سے ممکن ہوتا ہے۔انسانی رویے برداشت، رواداری سے بدلتے ہیں۔آنے والا کل گزرے ہوئے کل سے مختلف ہوتا ہے اس کے مسائل کے امکانات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ہر عہد کے تقاضے رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ان رجحانات اور تقاضوں سے زندگی کو ہم آہنگ کرنا ہی انسانی کردار کی آزمائش ہے۔ناسٹلجیائی رجحان میں صرف گزرے ہوئے عہد کی کہانیوں اور واقعات کا بیان نہیں ہوتا بلکہ ماضی کی بازیافت کے ساتھ ساتھ مٹتی ہوئی اور مرتی ہوئی عظیم اخلاقی اقدار، روایات اور احساس و جذبات کا مجموعہ خیال ہوتا ہے۔دنیا میں یادیں تخلیق کرنے کا فطری نظام موجود ہے۔جو کہ سیٹلائٹ کا دور ہے یادوں کے ذخیرے میں کمی کا سبب ضرور ہے۔اجتماعی حافظہ کمزور ہو رہا ہے۔اس لیے ایسا کوئی آلہ کا ہونا ضروری ہو گیا ہے۔جس کی مدد سے یادوں کو پرفیوم، خوشبو کی طرح شیشیوں میں بھرا جاسکے تاکہ وہ کبھی مٹ نہ سکیں اور وہ کبھی بھی باسی اور بدمزہ نہ ہوں اور جب جی چاہے شیشی کا کارک ہٹا کر ہم پھر سے ان یادوں میں زندہ رہ سکیں۔

قیام پاکستان کے بعد ادبی منظر نامہ ایک طرح سے ماضی کی یادوں کی بھینٹ چڑھتا ہے۔ادیب معاشرے کا حساس طبقہ ہوتا ہے۔اپنے ارد گرد کے حالات و سماجی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے۔اپنے عہد کی عکاسی ان کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔تقسیمِ ہند کا تجربہ ایک اجتماعی تجربہ ہے۔ہجرت، تقسیم اور غیر انسانی رویوں کی وجہ سے حساس طبقہ متاثر ہو کر ماضی کی یادوں میں چلا جاتا ہے۔قیامِ پاکستان کے بعد ادب میں مختلف رجحانات زیرِ بحث آتے ہیں۔ناسٹلجیا، رومانی، علامتی رجحان، حقیقت نگاری، ترقی پسندی اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر عصری رجحانات کا اظہار ادبی پیرائے میں کسی نہ کسی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔رجحان کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

"ادب میں رجحان ایک ایسے رخ یا میلان کی جانب اشارہ ہے جو کسی خاص قسم کے موضوع سے تعلق رکھتا ہو، یعنی یہ ایک ذہنی رویہ ہے۔"[۱۵]

ادب انسانی حیات اور انسانی سماج کا عکاس ہوتا ہے۔ حالات اور خیالات کے بدلنے سے انسانی تصورات میں تبدیلی آتی ہے۔ تصورات کے بدلنے سے رجحانات اور میلانات میں لچک کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ ادب میں رجحانات اور میلانات کے ذریعے نئے موضوعات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ بدلتے حالات میں جو نیا خاص رویہ پروان چڑھتا ہے اسی کے تحت ادیب اور سماجی دانش ور لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی رجحان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ادب میں نئے رجحانات، بدلتے حالات اور ان کے نتیجے میں نئے نئے خیالات اور نظریات کے زیرِ اثر پیدا ہوتے ہیں۔ جب معیاروں میں تبدیلی ہوتی ہے اقدار نئی صورتیں اختیار کرتے ہیں تو ادب بھی ان سے متاثر ہوتا ہے۔"[۱۶]

اردو ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کے ابتدائی آثار دبستانِ دہلی کے شعرا کے ہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس عہد کے تخلیق کار اور فن پارے میں اپنے ماضی کی یادوں کی جھلک اور کسک محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ شعرا اپنے عہد کا نوحہ لکھتے ہوئے موجودہ عہد کی تلخیوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ مٹتی ہوئی اقدار، آدرشی شکشت اور اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی حسین یادوں کی ایک طویل تاریخ ہے۔ جب سامراج کے آنے سے ان کے ہاں تبدیلی آتی ہے۔ لوگ دربدر ہوتے ہیں، لوگوں کو اپنی روایات، اقدار اور رسومات سے دور رکھا جاتا ہے اور ایک نئے نظام میں جینے پر زبردستی یا مجبوری کے تحت آمادہ کیا جاتا ہے تو ایسے میں لوگوں کے ہاں اپنے ماضی کو یاد کرنا ایک فطری عمل کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ماضی کو یاد کر کے ایک راحت کا احساس زور پکڑتا ہے۔ دہلی کے شعرا جب ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو ان کے کلام میں دہلی ایک استعارہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ میر اور غالب کے کلام میں اپنے عہد کا نوحہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

کلامِ میر میں ناسٹلجیا ماضی کی حسین یادوں کی صورت میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دہلی پر آئے روز حملے، دہلی سے ہجرت اور دہلی سے وابستگی کو میر کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دہلی سے ہجرت کے بعد بھی میر دہلی کی یادوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو

شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

دہلی اور لکھنؤ کے حالات کا نوحہ ادب کا زندہ موضوع ہے۔ جس کا اظہار نثری اور شعری پیرائے میں ہوتا ہے۔ میر کی طرح غالب بھی اپنے عہد کی مٹتی ہوئی تہذیب کا رونا روتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حال میں ایک بڑی تہذیب سے وابستہ لوگوں کی بے بسی اور اس کے ساتھ اختیار کردہ رویے پر افسوس کرتے ہیں۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

ایک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی

ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اردو ناول میں بھی ناسٹلجیا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ امراؤ جان ادا اور چار دیواری جیسے ناولوں میں لکھنوی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے۔ ماضی کی جھلک کے ذریعے زندہ اور باوقار تہذیب کے عہدِ عروج کو یاد کیا گیا ہے۔ اجتماعی روایات، نظام حیات کے اقدار کی پامالی کو عیاں کیا گیا ہے۔ انتظار حسین اپنی تحریروں میں لکھنوی تہذیب کی اقدار، روایات اور ایک زندہ تہذیب کی پامالی کا احساس دلاتے ہیں۔ یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اپنے عہد میں مٹتی ہوئی تہذیب کے خدوخال کو یاد کرتے ہیں۔ اپنے عہد میں پرانی اقدار کی پامالی کو نوحہ لکھتے ہیں۔ یہی احساس قراۃ العین کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کا ادبی منظر جزوی طور پر ناسٹلجیائی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔

ناصر کاظمی اپنے ماضی کے تجربات و مشاہدات کو شعری پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ایک ایسی فضا کو فروغ دیتے ہیں جس میں دھندلائی ہوئی یادیں ہیں۔ پرانے وقت کے دوست اور احباب کی محفلیں ہیں اور ان سے وابستہ زندگی کے امکانات ہیں۔ ناصر کاظمی نے ہجرت کے کرب کو تخلیقی شعری پیرائے میں بیان کیا ہے۔ دکھ اور محرومی کے سبب شعر میں کسک اور انسانی احساس کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

قیامِ پاکستان کے بعد ادبی منظر نامے میں یادِ ماضی، ماضی سے محبت اور ماضی پر نوحہ خوانی کی روایت شعری اور نثری ادب میں باقاعدہ رجحان کے تحت پروان چڑھتی ہے۔ پرانی اقدار کے بکھرنے اور نئی اقدار کے ساتھ تعلق کا دکھ اور اظہار زندگی کے بہت سے شعبوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد تحریروں میں ماضی کی یاد اور ماضی کی جھلک ایک کھڑکی کا کردار ادا کرتی ہے۔ جس کے ذریعے حال کا ماضی سے مکالمہ ہوتا ہے۔ افسانوی ادب میں تقسیم کے تجربات اور مشاہدات کو کرداروں کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ اس واقعہ کے بعد انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تخلیق کاروں نے اس واقعہ کے بعد ایک نئی صورت حال پر قابو پانے کی کوشش میں ماضی کی اجتماعی روایات، رہن سہن اور بھائی چارے کو یاد کیا ہے۔ ماضی کی یادوں کے ذریعے، ماضی کی بازیافت اور انسانی اقدار کو دکھایا گیا ہے۔ ماضی کی یاد سے حال کی تلخی کو سہنے میں آسانی ممکن ہوئی۔ ماضی پرستی کے زمرے میں کہا جاسکتا ہے کہ حال سے نجات کے لیے ماضی میں جانا ایک تعمیری عمل نہیں لیکن ماضی کے تجربات و مشاہدات سے سیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ انسانی شخصیت پر ماضی کے اثرات مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں ممکن ہیں۔ ماضی انفرادی صورت اور اجتماعی صورت میں ایک معتدل رویہ ہے۔ ماضی کی یادوں کو تحریروں میں انتظار حسین، قراۃ العین حیدر اور خدیجہ مستور نے بخوبی استعمال کیا ہے۔ ان تحریروں کے ذریعے گزرے ہوئے عہد کی اجتماعی فضا، رجحانات اور نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان تحریروں میں کرداروں کے ذریعے اجتماعی زندگی کے تصورات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

انسان اور وقت دونوں کی نوعیت اور فطرت ایک جیسی ہے۔ چلے جائیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے۔ یوں لگتا ہے کہ دونوں کا خمیر مسافر خانے کی مٹی سے اٹھا ہے۔ یہ دونوں اپنے پیچھے جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں وہ صرف یادیں ہیں۔ یاد

انسانی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یادیں جو کہ ہمارا گزرا ہوا وقت اور اپنی چشم شوق سے دیکھے گئے مناظر ہیں۔ غریب، دولت مند، عام انسان یا کوئی خاص شخصیت یادیں ہر انسان کے لیے اس کا انمول خزانہ ہوتا ہے۔ یادیں پرندوں کی مانند ہوتی ہیں۔ جو کہ محبتوں کے فروغ اور نفرتوں کے خاتمے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یادیں بنیادی طور پر خود پر بیتا ہوا وقت اور دیکھے گئے مناظر ہیں۔ اس لیے یہ انسان کے ماضی کی عینی شاہد ہے۔ یادوں کو محفوظ کرنا ضروری ہے اپنے آپ پر بیتے ہوئے وقت کو یاد تو ہر کوئی کرتا ہے لیکن انہیں ضبطِ تحریر میں کوئی کوئی ہی لاتا ہے۔ یادیں یا یادداشتیں تحریر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صفحات بھرے جائیں یا سنسنی خیز ذاتی واقعات کو بیان کیا جائے بلکہ یادیں تحریر کرتے ہوئے ماضی میں گم ہو کر معاشرتی تاریخ کے اجتماعی زاویوں کی ترجمانی کی جائے۔ یہ یادیں کسی عہد کی اجتماعی فضا، ماحول اور رجحانات کی عکاس ہوتی ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان ان مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔ ماضی کی یاد کے ذریعے، ماضی کی بازیافت کی جاتی ہے۔ گزرے ہوئے عہد کے واقعات کو یاد کرنا ماضی پرستی نہیں ہے بلکہ ماضی کے تجربات کی عینک سے حال میں اس کی نوعیت و اہمیت کا اقرار ہے۔ صدیوں پہلے سقراط کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔ سچائی کے علم بردار ہونے کی صورت میں سقراط کو یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کو یاد کرنا ظالموں کی مذمت اور ان کے عزائم کی حوصلہ شکنی کرنا ہے۔ ان دو مثالوں کے ذریعے حال میں ظالموں اور عقل کے اندھوں کی مذمت کی جائے اور ان کا راستہ روکا جائے۔ حق اور سچائی کے لیے زہر نوش کرنے کے جذبے کو زندہ جاوید رکھا جا سکے۔ سچائی کا پرچار اور ظلم و ظالم کے خلاف جنگ کا جذبہ بیدار کرنا انسان کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

ان دو شخصیات کے افکار و نظریات یا کردار کو یاد کرنے سے نہ ہی ذہن، انسانی زندگی اور معاشرے کو زنگ لگتا ہے نہ ہی انسانی فکر پر جمود طاری ہوتا ہے۔ یادِ حسین مظلومیت کی آواز ہے۔ یادِ سقراط سچائی کے علم برداروں کی نشانی ہے۔ ادب انسانی زندگی کا عکاس ہے۔ اسی طرح انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔ ناسٹلجیائی کیفیت میں ادب اپنے لاشعور اور اپنی اجتمائی تاریخ سے زندہ مثالوں کے ذریعے انسان احساسات کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ناسٹلجیائی رجحان کے اجزا میں رومانوی، تہذیبی، تاریخی اور سیاسی رجحانات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ناسٹلجیا ان اجزا کے تناظر میں انسانی سماج اور انسان کے رویوں کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ ناسٹلجیا اور نفسیات کے مطالعے سے تخلیق کار

اور تخلیق میں پائے جانے والے رجحانات و نظریات کی تلاش و تعین کی جاتی ہے۔ناسٹلجیا روایتی معنوں سے ہٹ کر ایک رجحان کے طور پر سامنے آتی ہے۔اس رجحان کے تحت ادب کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ادب اور ادیبوں کے نظریات و تصورات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اردو ادب میں ناسٹلجیائی رجحانات کی طرح دیگر رجحانات نے ادب کو متاثر کیا ہے۔ جس میں رومانوی رجحان، حقیقیت نگاری اور علامتی رجحان جیسے رجحانات قابلِ ذکر ہیں۔۱۹۴۷ء کی ہجرت نے اردو ادب میں ناسٹلجائی رجحان کو فروغ دیا۔اس حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

"یہ موضوع عمومی سطح پر ہجرت کے عمل، اس کے حالات وواقعات، ہجرت کر کے آنے والوں کے مسائل اور معاشرتی حوالوں سے ہجرت کے اثرات کی عکاسی کے طور پر برتا گیا۔ تقسیم کے فوراً بعد کے افسانوں میں یہی صورت ملتی ہے۔لیکن خصوصی طور پر اس کو ایک بڑے فکری پھیلاؤ کی بھی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہ فکر اس کرب سے عبارت تھی جو اپنی بنیادوں سے جدا ہونے کے بعد کسی بھی ذی روح کو بے چین کر دیتا ہے۔کرب کا یہ پہلو زیادہ تر ان افسانہ نگاروں کے ہاں نمایاں ہوا جو ہجرت کر کے پاکستان آئے۔اپنے آباؤاجداد کی سرزمین اور اس کے متعلق تہذیب کی یادیں ایک مسلسل رو کی صورت میں سامنے آئیں اور ماضی پرستی کا وہ رویہ جو اصطلاحاً ناسٹلجیا(Nostalgia) کہلاتا ہے۔"[۱۷]

ہر دور میں ادب کا مطالعہ ایک نئی بصیرت کا متقاضی رہا ہے۔ تخلیق کار اور تخلیق کا مختلف ادبی نظریات اور تصورات کے تناظر میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔فن پارے کی مختلف تعبیرات پیش کی جاتی ہیں۔سماجی علوم یا کسی مخصوص فکر کے تناظر میں فن پاروں کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ادب میں نفسیاتی مطالعے سے کرداروں کی حرکات و سکنات اور ان کرداروں کے ذریعے سماج میں ہونے والے عوامل کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

نفسیاتی مطالعے کے ذریعے عہد کی اجتماعی فکر، لاشعور کے ساتھ ساتھ مصنف کی شخصیت کے افکار کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ادب میں عمرانی، مارکسی اور نفسیاتی دبستانوں کے تصورات و نظریات کے تناظر میں فن پاروں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد برصغیر کے سیاسی و سماجی منظرنامے پر تبدیلی سے ادیبوں کے تصورات و نظریات میں تنوع پیدا ہوا۔قیام پاکستان کے بعد ایک نیا معاشرہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ہجرت، تقسیم، انفرادی دکھ، محرومی، اجتماعی معاشرے کے حالات، اقتصادی بحران، اپنوں سے دوری، فسادات سے جنم لینے والا سماج غیر یقینی صورت حال کا شکار ہوتا ہے۔

ادب کا مطالعہ ہر طرح زاویہ نظر سے کیا جاسکتا ہے۔کسی خاص رجحان یا مخصوص فکر کی مقبولیت کے منشور کے مطابق ادب تخلیق کیا گیا۔اس کی عوام میں مقبولیت بھی ہوئی اور اس کو پذیرائی بھی ملی۔اس طرح ایک رجحان ناسٹلجیا ہے جس کے اثرات ۱۹۴۷ء کے بعد تحریروں میں کثرت سے دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کے عوامل نفسیاتی، سیاسی و سماجی تبدیلیاں ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر شکیل الرحمن لکھتے ہیں:

"فن کار اپنے جمالیاتی تجربوں کے ساتھ اپنے پورے وجود کو کائنات سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔کائناتی روح میں اس کی روح جذب ہو جاتی ہے۔وہ اپنی نفسی قوت یا سائیکی(Psyche) سے تخلیقی عمل میں مدد لیتا ہے۔اس کے موضوع اور اسلوب میں نفسی قوت اور سائیکی کی پہچان ہوتی ہے۔موضوع کے انتخاب اور اسلوب کی تشکیل میں داخلی اور اندرونی روشنی کی اہمیت ہے۔موضوع اور اسلوب دونوں داخلیت اور شدید اندرونی کیفیات کو پیش کرتے ہیں۔"[۱۸]

انسان کے لیے اہم ترین مطالعہ خود انسانی زندگی ہے۔دنیا میں نہ جانے کتنی حقیقتیں ہیں جنھیں انسان اپنے تجربے سے دریافت کرتا ہے مگر انسانی زندگی کی سرگزشت ان سب میں اہم ہے۔جب سے انسان عالمِ وجود میں آتا ہے اس وقت سے لے کر اس کی وفات تک زندگی پر کیا کچھ گزرتی ہے اس کی تفصیل نہ صرف دلچسپ بلکہ سبق آموز بھی ہوتی ہے۔پھر ہر شخص کے حالات جدا ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کی تفصیل باعثِ کشش بھی ہوتی ہے۔ادب انسانی زندگی کی حقیقتوں کا عکاس ہوتا ہے۔دکھ اور سکھ ان حقیقتوں کے دو مختلف پہلو ہیں۔تلخیوں کا ذکر انسان کو افسردہ حال بناتا ہے۔نفسیاتی عنصر کی موجودگی میں دیکھا گیا ہے کہ حال کی تلخیوں کے سبب انسان ماضی میں پناہ لیتا ہے۔ماضی ایک سایہ دار درخت کی مانند ہے۔دھوپ سے نجات حاصل کرنے کی صورت میں متبادل کے طور پر آدمی اس کی پناہ حاصل کرتا ہے۔ماضی کی یادوں کو کشید کر کے حال پر تفکر کرنا ایک خصوصیت ہے لیکن بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ ماضی کی یادوں میں گم ہونے کی کوشش انسان کو حال سے بیگانہ کر دیتی ہے اور حال سے فرار ہونے کی کوشش کی جاتی ہے ایسے میں یوں لگتا ہے گوں کہ ماضی ایک آسیب کی طرح آدمی کا پیچھا کرتا ہے۔اس طرح انسانی جذبات اور رویوں پر ماضی مثبت اثرات کے بجائے منفی اثرات کا حامل ہو کر سامنے آتا ہے۔

ناسٹلجیا ماضی کی بازیافت کا عمل ہے۔پرانی اقدار کا متقاضی ہے۔منظم تہذیب اور اس سے وابستہ فکر رجحانات، اقدار اور روایات کا موجودہ عہد کے ساتھ موازنے کا نمونہ اظہار ہے۔اردو ادب میں دیکھا جائے تو تہذیبی عناصر کی عکاسی

میر اور غالب کے کلام میں مغل تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔ اخلاقی اقدار کی پامالی کو دیکھ کر انسان ماضی کی تہذیب کو نہ چاہتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر یاد کرتا ہے۔ اس تہذیبی سالمیت اور اس کے احیاکے حوالے سے انتظار حسین لکھتے ہیں:

> "جب تہذیبی سالمیت رخصت ہو چکی ہو تو اجتماعی احساس کا ترجمان بننے کے لیے افسانہ نگار کو بہت جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اسے باطنی زندگی کی گہرائیوں میں یہ دریافت کرنا پڑتا ہے کہ وہ کون سے احساسات، آدرش، تمنائیں اور موروثی شکلیں ہیں جو تہذیبی زندگی اور جذباتی چلن میں تفرقہ پڑ جانے کے باوجود مشترک میں اور سماج کے ایک فرد کا دوسرے فرد سے رشتہ جوڑتی ہے۔ ان مشترکات میں ایک تو ماضی کا ورثہ ہوتا ہے۔ حاضر میں بے شک بے ربطی کی صورت پیدا ہو جائے مگر یہ ورثہ یادوں کی صورت میں اجتماعی حافظہ میں محفوظ رہے۔"[19]

نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان کسی بھی جگہ یا مقام پر پہنچتا ہے تو اپنے آبائی وطن، علاقے اور ماضی سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اگر وجودی طور پر یہ دور ہو جائے لیکن جذبات و احساسات کے حوالے سے وہ اپنے ماضی میں سکون و راحت محسوس کرتا ہے۔ یہاں پر ماضی کسی ائیر کنڈیشن روم سے زیادہ سکون مہیا کرتا ہے۔ یہ ماضی جو کہ ایک سایہ دار اور پھل دار درخت ہے اس کے سائے میں بیٹھ کر حال کی محرومی اور تلخی کو ایک گھونٹ میں پی کر ماضی کے جھروکوں کو محسوس کرتا ہے۔ یہ صورت حال کسی نہ کسی صورت میں انسان کے حصے میں آتی ہے۔ اس کا بیان کسی حد تک تحریر کی صورت میں آتا ہے تو کہا جاتا ہے ماضی کی یادوں کو تحریر کی صورت میں پیش کیا ہے یا فلاں ماضی کی یادوں سے آسودگی کشید کرتا ہے۔ ماضی کی اخلاقی اقدار، روایات، رسوم اور رہن سہن کو ایک ایسے انداز میں لے کر جاتا ہے جہاں کی یادیں مر رہی ہیں۔ دھندلی دھندلی یادیں تحریروں کی صورت میں ایک بیش بہا خزانے کی مانند ہوتی ہیں۔ ماضی کے سحر میں اگر انسان اس قدر مبتلا ہو جائے تو یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ ماضی پرست ہے۔ انسانی جذبات میں توازن بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انسانی رویے جب تک متوازن ہوتے ہیں تب تک ماضی، حال اور مستقبل میں ایک اعتدال دکھائی دیتا ہے۔ عدم توازن انسانی رویوں، انسانی سماجی میں بگاڑ اور تصادم کا سبب بنتا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ آج کی دنیا میں اعتدال ہی موثر ہتھیار ہے۔ ضرورتوں میں اعتدال، مزاج اور رویوں میں اعتدال، خاموشی اور گفتار میں اعتدال، تنہائی اور محفل میں اعتدال اور ہجر و وصال میں اعتدال یہی متوازن رویہ ہے۔

گئے دور کے لوگ اگر باقی ہیں اور اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں تو یہ ایک غنیمت ہے۔ دورِ حاضر میں ماضی کو یاد کرنے کا عنصر ختم ہوتا جارہا ہے۔ زندگی مشینی اور مصنوعی صورت اختیار کر رہی ہے۔ انسان مصروف سے مصروف تر ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں ماضی کی یادوں میں مبتلا ہو کر حسن کشید کرنا اور پرانی تہذیب و روایات کی پامالی کی آہو پکار کرنا ایک صحت مند رویہ ہے لیکن ماضی کو یاد کرتے ہوئے حال کو مسترد نہین کرنا اس کے رد میں ماضی کو سب کچھ قرار دینا بھی بے اعتدالی ہے۔ اس سے حال اور عہدِ حاضر کے معاملات، مسائل اور امکانات سے مکالمے کی گنجائش ہی ختم ہوتی ہے۔ یوں ماضی کی یاد کو نفسیاتی بیماری اور حال سے فرار کے زمروں میں لیا جائے گا۔ اس سے یہ ہوگا کہ ماضی جو کہ یادوں اور اجتماعی طور پر قوموں کا سرمایہ ہوتا ہے اس کی نوعیت اور اہمیت کمزور ہو جائے گی۔ جو کہ کسی بھی صورت میں صحت مند رویہ نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔

ناسٹلجیائی رجحان کا محرک بنیادی طور پر سماجی ناہمواری ہے۔ جو کہ ذہنی استحصال سے طاقت پکڑتا ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان باشعور اور حساس انسان کے ذہنی رد عمل کا نتیجہ ہے۔ جس کے ماحول کو سماجی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختہ مشق بنا لیا ہو۔ اردو ادب میں ناسٹلجیا کا عروج یا نقطہ آغاز ایک حد تک اس رد عمل کے سبب ہے۔ میر اور غالب کے دور میں انگریز سامراج کے تشدد مسلسل سیاسی اور سماجی ناہمواریوں کے سبب ذاتی اور اجتماعی الجھنوں نے فرد کی زندگی میں مسلسل ناکامیوں کا کردار ادا کیا۔ یہی صورت حال قیام پاکستان کے بعد بھی پیش آتی ہے تو ادیب اور سماجی دانش ور نئی تہذیب اور نئے ماحول کے ساتھ لاتعلقی کا اظہار شعری اور نثری پیرائے میں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں ناسٹلجیائی رجحان کی بنیاد یہی عوامل بھی ہیں جو کہ اس رجحان کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

> "کسی بھی معاشرے کا ادب اس کے ماضی کی دستاویز، اس کے حال کا عکاس اور اس کے مستقبل کا نقیب ہوتا ہے۔ ادب بھی تاریخ کی طرح اپنے دور کے اہم واقعات کو محفوظ کرتا ہے۔ تاریخ واقعات، رجحانات اور تحریکات کو براہ راست اور غیر جانب داری کے ساتھ درج کرتی ہے جبکہ ادب انہی واقعات، رجحانات اور تحریکات کا تجزیہ اور تنقید کرتا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کو فنکاری اور دردمندی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ادب تاریخ پر نئے زاویے سے روشنی ڈالتا ہے۔ گویا ہر دور کا ادب اپنے عصری رجحانات، افکار اور اقدار کے بارے میں آگاہی حاصل

کرنے میں مدد و معاون ہو تا ہے۔اس لحاظ سے ادب ایک طرح کی ذہنی، سماجی اور ثقافتی تاریخ ہے۔"[۲۰]

نفسیات اور ادب کے مطالعے میں انسان اور انسانی رویوں کے محرکات، فرد کی ذاتی زندگی اور اس کے ارد گرد کے ماحول کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی پر اپنے عہد کے حالات و واقعات کا اثر ہونا کسی حد تک فطری ہے۔ نفسیات میں فرائیڈ کے باطنی تجربات، مشاہدات اور احساسات کو اہمیت دیتے ہیں۔ فرد کی محرومی اور حسرتوں کو اہم عوامل قرار دیتے ہیں۔ فرد کی شخصیت کے اجزا میں تحلیل نفسی، لاشعوری خواہشات اور دیگر بنیادی مباحث کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "فرائیڈ کے نظریات میں جدید ادب کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ تحلیل نفسی کا نظریہ ہماری تہذیب اور نئے ذہن کا بنیادی عنصر بن چکا ہے۔ فرائیڈ کے نظریے کے مطابق، شخصیت کے اجزا جنسی خواہش، اس خواہش کا والدین پر مرکوز ہونا اور والدین سے تطبیق کی خواہش سے ترتیب پاتے ہیں۔ فرائیڈ کے خیال میں شخصیت انسان کے سماجی دباؤ اور رشتوں کا نتیجہ ہے۔"[۲۱]

حال کی ناآسودگی، اپنوں سے دوری، نئے ماحول کا سامنا اور معاشی عدم استحکام ناسٹلجیائی رجحان کو تقویت دینے کا سبب بنتا ہے۔ماضی کی رونقیں کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہوتی ہیں۔ تاریخ کے صفحات آگے ضرور بڑھتے ہیں۔ لیکن لاشعور میں ماضی کے واقعات اور حالات دھندلے دھندلے اثرات کے ساتھ اذہان میں موجود ہوتے ہیں۔ حال کی لگام، تخلیق کار کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔لیکن ماضی پر کسی کا بس نہیں چلتا اور نہ ہی اس سے دامن چھڑا سکتے ہیں۔ماضی بھی زمانہ حال میں موجود انسان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔یادیں گئے دور کے چراغ ہیں ان کی روشنی میں حال کا مشاہدہ اور تجزیہ معاشرے میں بہتری کے امکانات کو ظاہر کرتا ہے۔ناسٹلجیائی رجحان کو موجودہ دور میں فروغ دینے کا حوالہ عالمی دنیا کی سیاسی اور سماجی تبدیلیاں بھی ہیں۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں نائن الیون کا واقعہ ہوتا ہے۔ اس کے اثرات سے دنیا بھر کے لوگ نفسیاتی، معاشی اور سیاسی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کی طرح پاکستانی معاشرہ بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ پاکستان میں خوف، دہشتگردی، سیاسی و معاشی عدم استحکام، خصوصی طور پر امن و امان کی خراب ترین صورت اختیار کرتے ہیں۔ پاکستان کا صوبہ خیبر پختونخواہ ان حالات سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ اپنے ہی ملک میں ہجرت اور نقل مکانی پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس دوران لوگوں کے ہاں ناسٹلجیائی رجحان زور پکڑتا ہے۔نفسیاتی حوالے سے یہ احساس ایک مربوط رجحان کی صورت اختیار کرتا

ہے۔ متاثرین اپنے گھر بار چھوڑ کر نئے ماحول میں اپنی زندگی کی بقا کی جنگ لڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس عالمی واقعے کے سبب پاکستانی یورپ اور عرب ممالک سمیت پاکستان میں ایک نامعلوم خوف کی علامت اختیار کرتے ہیں۔ ان حالات سے ناسٹلجیائی رجحان علاقائی صورت اختیار کرتا ہے۔

ادب اور نفسیات کا تعلق ایک طرفہ نہیں ہوتا۔ جہاں معاشرتی عوامل اور محرکات ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہاں نفسیات بھی ادبی رجحانات، اور ادب سے اثرات قبول کرتا ہے۔ ادب انسان کے ذہن، جذبات اور عمل کو متاثر کرتا ہے۔ لیکن فرد کے لاشعور میں موجود رہتے ہیں اور اس کے مخصوص رویوں اور رجحانات میں تبدیلی کا موجب بن جاتے ہیں۔

ادب اور نفسیات کے اثرات سے افراد اور معاشرہ لاشعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ معاشرتی تغیر کے بے شمار اسباب ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں مخصوص جذبات، ذہنی رجحانات اور نفسیاتی عناصر کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ان نفسیاتی و سماجی عوامل سے فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ فن پارے میں اپنے عہد کے رجحانات اور نظریات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں اس پہلو کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر مین تصور غم اور مزاح کے عنصر کو ایک ایسے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس کے ذریعے سماجی و نفسیاتی عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر ناسٹلجیا کے تناظر میں ایک وسیع موضوعاتی و نفسیاتی عناصر کا منظر پیش کرتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں برتے جانے والے موضوعات میں سماجی اور نفسیاتی نوعیت کے امکانات، اخلاقی اقدار کا بحران، ماضی کی بازیافت اور اقدار و روایات کی زوال آمادگی نمایاں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا "ماضی" روایتی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ یوسفی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تہذیبی اقدار کے بجھتے چراغوں کے دھوئیں اور گم شدہ سماجی روایات کی دھند میں سے ماضی کی تخلیقی و امکانی سطح کو اجاگر کرتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں یادوں کی یہ بستی اپنے تمام تر حسن اور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر ناسٹلجیا کے تناظر میں پیش کش پائی جاتی ہے۔ اس تناظر سے یوسفی کی نثر کا مطالعہ جاری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دیوندر اسر۔ادب اور نفسیات،(دہلی:مکتبہ شاہراہ،۱۹۴۳ء)ص۹۔

۲۔ James Williams. *The Principal of Psychology Volume 1* (Doner Publications. Inc, 1950) P1.

۳۔ Allport F.H. Social Psychology, (New York: Houghton Mifflin,1923) P2.

۴۔ https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/nostalgia?q=Nostalgia(مورخہ:۱۴/جون۲۰۲۳ء:بوقت ۲:۳۳دن)

۵۔ https://www.urduenglishdictionary.org/English-To-Urdu-Translation/nostalgia/Page-1.htm(مورخہ:۱۴/جون۲۰۲۳ء:بوقت۲:۳۸دن)

۶۔ https://www.urbandictionary.com/define.php?term=Nostalgia (مورخہ:۱۴/جون۲۰۲۳ء:بوقت ۲:۴۰دن)

۷۔ https://www.wikiwand.com/en/Nostalgia(مورخہ:۱۴/جون۲۰۲۳ء:بوقت ۳:۰۰دن)

۸۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Nostalgia(مورخہ:۱۴/جون۲۰۲۳ء:بوقت ۳:۳۲دن)

۹۔ جاوید، قاضی۔ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں(مشمولہ ماہ نو، مدیر:مظفر عباس)ص ۲۲۔

۱۰۔ یوسفی، مشتاق احمد۔آب گم(کراچی:جہانگیر بک،۲۰۱۰ء)ص۱۸۔

TH-27399

۱۱۔ قرۃ العین حیدر، خصوصی مطالعہ، مرتبین: سید عامر سہیل، ڈاکٹر قمر رئیس، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۳ء، ص ۵۱۲۔

۱۲۔ پرویز، اسلم۔ مقدمہ (مشمولہ: جانکی بائی کی عرضی، مصنف: حامد مرزا بیگ، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء) ص ۳۳۔

۱۳۔ بٹ، عاصم۔ عبداللہ حسین شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء) ص ۵۸۔

۱۴۔ سہیل، احمد۔ اردو افسانے کا ناسٹلجیا (ملتان: تدوین پبلی کیشن، س۔ن) ص ۳۲۔۳۳۔

۱۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر۔ آزادی کے بعد اردو ناول (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷ء) ص ۱۳۵۔

۱۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ اردو ادب میں جدید رجحانات (مشمولہ: مقالات، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۸۳، ص ۱۸۴۔

۱۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ: بیسوی صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں (اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۸ء) ص ۲۰۴۔

۱۸۔ شکیل الرحمن، ڈاکٹر۔ ادبی قدریں اور نفسیات (دہلی: مکتبہ جامعہ اسلامیہ، ۱۹۹۵ء) ص ۶۲۔

۱۹۔ حسین، انتظار۔ جنم کہانیاں (افسانہ اجودھیہ)، ص ۴۷-۴۸۔

۲۰۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر۔ اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۲۱ء) ص ۲۹۔

۲۱۔ دیوندر اسر۔ ادب اور نفسیات (دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۹۳ء) ص ۱۳۔

باب دوم:

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر و اقداری ناسٹلجیا: تلاش و تعین

باب دوم:

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر و اقداری ناسٹلجیا: تلاش و تعین

اقداری قدریں :

اقدار وہ مضبوط اصول و قواعد اور ترجیحات ہیں جو مختلف حالات میں ہمارے اعمال اور فیصلوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اس تمام چیزوں کی نمائندہ ہوتے ہیں ہیں جو افراد کے لیے اہم اور مطلوبہ ہیں اور ان کے رویوں، طرز عمل اور زندگی کے انتخاب کو تشکیل دے سکتی ہیں۔

عمومی طور پر اقدار ان اصولوں یا قواعد کو کہا جاتا ہے جنہیں افراد یا معاشرے اہم سمجھتے ہیں اور اپنے طرز عمل اور فیصلہ سازی کی رہنمائی کے لیے استعمال بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ اخلاقی، مذہبی، انفرادی اور اجتماعی انتخاب کی بنیاد کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اقدار کی نوعیت انسانی معاشرے میں مختلف ہو سکتی ہے. افراد، لیکن کچھ بنیادی اقدار ہوتے ہیں جو کہ اکثر بیشتر زیر بحث آتے ہیں۔ جیسا کہ "ذاتی اقدار" یہ انفرادی اصول اور قواعد ہیں جو کسی کے طرز عمل اور انتخاب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً فرد کی دیانتدارانہ رویہ، ایمانداری اور اخلاقی بتاؤ، ذمہ داریاں، اپنے کسی قول و فعل کے لیے جوابدہ ہونا ہمدردی، دوسروں کی ہمدردی اور دیکھ بھال کرنا، احترام، اور دوسروں دوسروں کے ساتھ عزت اور احترام کے ساتھ برتاؤ کرنا شامل ہے۔ فرد کی آزادی اظہار رائے اور خود مختاری کی قدر کرنا یہ ذاتی یا انفرادی اقداری کا تقاضا کرتا ہے۔

ثقافتی اقدار جو کہ کسی سماجی عمل کے نمائندگی کرتے ہیں یہ اقدار کسی خاص ثقافت یا معاشرے اور افراد کی اجتماعیت کا اظہار کرتے ہیں. ذریعہ مشترکہ ہیں۔ وہ سماجی اصول وروایات اور اقدار کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں جیسا کہ انفرادی ضروریات پر اجتماعی فلاح و بہبود کو فوقیت دینا، فرد کی رائے کو فوقیت دینا، مساوات اور مساوی مواقع اور انصاف کی قدر کرنا، روایت، رسم ورواج اور ثقافتی ورثے کا تقدس، ہم آہنگی، امن اور سماجی ہم آہنگی کے لیے راہ ہموار کرنا، بزرگوں کا احترام، پرانی نسلوں کی حکمت اور تجربے سے مستفید ہونا یہ چیزیں ثقافتی اقدار کی نمائندہ عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار اور اس قدر کی جہاں تک بات ہوتی ہے تو یہ اقدار صحیح اور غلط کے، ظالم و مظلوم، تصورات سے متعلق ہیں اور افراد کی اخلاقی فیصلہ سازی کو متاثر کرتے ہیں ان سماجی موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں جیسا کہ انصاف اور غیر جانبداری کو برقرار رکھنا، ایمانداری اور دیانت داری میں سچائی اور اخلاص کا مظاہرہ

کرنا، اخلاقی اصولوں پر عمل کرنا، دوسروں کے جذبات کو سمجھنا اور بانٹنا، بے غرضی اور دوسروں کی بھلائی کی فکر کرنا، رواداری، مختلف عقائد اور آراء کی قبولیت اور احترام کرنا۔

پیشہ وارانہ اقدار: یہ اقدار مخصوص پیشوں یا شعبہ ہائے کار کے لیے مخصوص ہیں۔ مثلاً کام میں اعلیٰ معیار اور معیار کے لیے کوشش کرنا، تعاون اور انسانی رویوں کو فروغ دینا، احتساب کسی کے پیشہ ورانہ اعمال کی ذمہ داری لینا، مسلسل سیکھنے کی کوشش جاری رکھنا اور پیشہ ورانہ ترقی کی قدر کرنا یہ اخلاقی اقدار کے زمرے میں آتا ہے. اس کے ساتھ ساتھ سماجی اقدار کا تعلق ہے تو سماجی اقدار وہ اصول و اعتقادات ہیں جن کی بنیاد افراد پر مبنی ہوتی ہے. یہ اقدار و قواعد کسی فرد واحد کی نہیں بلکہ اجتماعی معاشرے کی عکاس ہوتے ہیں یہ اقدار کسی خاص کیمونٹی یا ثقافت کے اندر سماجی اصولوں، رویوں اور تعاملات کی بنیاد کے طور پر کام کرتی ہیں۔ سماجی اقدار مجموعی طور پر معاشرے کی طرف سے برقرار رکھنے والی توقعات، معیارات اور نظریات کی تشکیل کرتی ہیں۔ یہاں سماجی اقدار کی مثالیں بے شمار ہیں جیسا کہ تمام افراد کے پس منظر، جنس، نسل، یا سماجی اقتصادی حیثیت سے قطع نظر، یکساں مواقع اور انصاف پسندی کی قدر کرنا، مساوی حقوق مہیا کرنا، افراد کے درمیان عقائد، ثقافتوں اور نقطہ نظر میں فرق کو پہچاننا اور ان کی تعریف کرنا اور شمولیت کو فروغ دینا۔

سماجی انصاف: معاشرے کے اندر وسائل، مواقع اور حقوق کی تقسیم میں انصاف اور مساوات کی وکالت کرنا۔

شہری تعامل کیمونٹی میں فعال شرکت، ذمہ داری، اور شمولیت کی حوصلہ افزائی کرنا، بشمول ووٹنگ، رضاکارانہ امور اور سماجی مسائل کی وکالت وغیرہ شامل ذکر ہیں. اس کے ساتھ ساتھ تعلیم، ذاتی ترقی اور سماجی ترقی کو فروغ دینے کے لیے علم، سیکھنے، اور مہارتوں کی نشوونما کو اہمیت دینا، ماحولیات کے تحفظ اور تحفظ کی قدر کرنا، قدرتی دنیا کو پہنچنے والے نقصان کو کم کرنے والے طریقوں کو فروغ دینا، خاندان اور برادری میں سماجی ہم آہنگی اور فلاح و بہبود کو فروغ دینے میں مضبوط خاندانی تعلقات اور معاون سماجی تعلقات کی اہمیت پر زور دینا یہ بات ضروری ہے کہ سماجی اقدار کی نوعیت اور ماہیت مختلف عہد اور معاشروں اور تاریخی ادوار میں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ان کی تشکیل مختلف عوامل جیسے ثقافتی روایات، تاریخی واقعات، مذہبی عقائد اور سماجی تحریکوں سے ہوتی ہے۔ سماجی اقدار سماجی ہم آہنگی اور کیمونٹی کے اندر مشترکہ توقعات کی ترقی کے لیے ایک فریم ورک فراہم کرتی ہیں۔

اخلاقی اقدار اصولوں اور عقائد کا ایک مجموعہ ہیں جو افراد یا گروہوں کو اس بات کا تعین کرنے میں رہنمائی کرتے ہیں کہ کسی مخصوص تناظر میں کن کن چیزوں کو اخلاقی طور پر صحیح یا غلط سمجھا جاتا ہے۔ اخلاقی اقدار اخلاقی فیصلوں کا جائزہ لینے اور کرنے کے لیے ایک فریم ورک فراہم کرتی ہیں، اور وہ مختلف دائرہ ہائے کار جیسے ذاتی زندگی، پیشے اور معاشرے میں رویے اور اعمال کی تشکیل کرتی ہیں۔ جیسا کہ معیاری رہنما اصول، اخلاقی اقدار ان اصولوں اور

معیارات کی وضاحت کر کے طرز عمل کے لیے معیاری رہنما اصول قائم کرتی ہیں جن پر افراد یا گروہوں کو عمل کرنا چاہیے۔ وہ افراد کو پیچیدہ اخلاقی مسائل اور اخلاقی تحفظات کی بنیاد پر فیصلے کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ استدلال اور تجزیہ کرنا. اخلاقیات میں استدلال، تنقیدی سوچ، اور منطقی تجزیہ شامل ہوتا ہے تاکہ اعمال کے نتائج، اصولوں اور اخلاقی مضمرات کا جائزہ لیا جا سکے۔ اخلاقی اقدار افراد سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ دوسروں اور مجموعی طور پر معاشرے پر اپنے انتخاب کے ممکنہ اثرات پر غور کریں۔

آفاقی اقدار کے مباحث کی جہاں تک بات ہے اگرچہ مخصوص اخلاقی اقدار ثقافتوں اور فلسفیانہ فریم ورک میں مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن آفاقی اخلاقی اصول مختلف معاشروں میں تسلیم شدہ ہیں جیسے ایمانداری، انصاف اور خود مختاری کا احترام۔ یہ اصول اخلاقی اقدار کی بنیاد بناتے ہیں اور اخلاقی مباحث کے لیے مشترکہ بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اخلاقی اقدار اکثر افراد سے متضاد مفادات اور اقدار کو نیویگیٹ کرنے اور توازن قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہیں۔ اخلاقی فیصلہ سازی میں افراد کے حقوق، ان کے مختلف معاملات کے ممکنہ نتائج، اور فلاح و بہبود پر غور کرنا اور مسابقتی اخلاقی اصولوں کے درمیان توازن تلاش کرنا شامل ہے۔ اخلاقی اقدار پیشہ ورانہ دائروں تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے متعلقہ شعبوں میں افراد کے طرز عمل اور طرز عمل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ متفرق پیشوں میں اکثر اخلاقیات کے مخصوص ضابطے ہوتے ہیں جو متوقع اخلاقی طرز عمل کا خاکہ پیش کرتے ہیں اور پیشہ ور افراد کو ان اقدار کو برقرار رکھنا چاہیے۔ مثلاً طبی اخلاقیات، قانونی اخلاقیات، اور انجینئرنگ کی اخلاقیات شامل ہیں۔ اخلاقی اقدار جامد نہیں ہیں انہیں مسلسل عکاسی، تشخیص، اور موافقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے معاشرتی اصول تیار ہوتے ہیں، نئے اخلاقی چیلنجز ابھرتے ہیں، اور ان تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے اخلاقی اقدار کا دوبارہ جائزہ لینے اور اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے. اخلاقی اقدار ذاتی اور اجتماعی ذمہ داری کی اہمیت پر زور دیتی ہیں کہ افراد اپنے اعمال اور ان سے پیدا ہونے والے اخلاقی نتائج کے ذمہ دار ہیں۔ اخلاقی اقدار افراد کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں کہ وہ اپنے انتخاب کی ملکیت حاصل کریں اور ایسے طریقوں سے کام کریں جو دوسروں کی بہتر اور فلاح و بہبود کو فروغ دیں۔ اخلاقی اقدار انسانی معاشرے میں معاون کے طور پر کام کرتی ہیں، جو افراد کو ایسے فیصلے کرنے میں رہنمائی کرتی ہیں جو انصاف، ایمانداری اور احترام کے اصولوں کے مطابق ہوں۔ وہ اخلاقی رویے کی تشکیل، اعتماد کو فروغ دینے، اور ایک منصفانہ اور ہم آہنگ معاشرے کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی نثر نگاری: نفسیاتی عناصر واقداری ناسٹلجیا:

نثر نگاری کی جدید مباحث میں نثر کو دو حصوں علمی نثر اور تخلیقی نثر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ علمی نثر میں منتخب الفاظ میں اپنے خیالات و تصورات کا غیر جذباتی انداز میں اظہار کیا جاتا ہے۔ علمی نثر میں تشبیہ، استعارہ اور کنایہ سے گریز کیا جاتا ہے۔ علمی نثر میں اپنی بات کچھ یوں کی جاتی ہے کہ بغیر ابہام کے بات قارئین و ناظرین تک پہنچ جائے۔ علمی نثر وضاحت اور قطعیت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس نثر کی دوسری صورت تخلیقی نثر ہے۔ اس میں رمز و کنایہ کے ساتھ ساتھ تشبیہات واستعارے کی مدد سے زبان کو پرکشش بنایا جاتا ہے۔

تخلیقی نثر میں ادبی ذائقہ یا ادبیت کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ تخلیقی نثر میں جزئیات نگاری پر زور دیا جاتا ہے۔ الفاظ کے استعمال سے احساسات و جذباتی شدت پیدا کی جاتی ہے۔ تخلیقی نثر میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے ساتھ لطف اندوزی بھی اہم عنصر ہے۔ تخلیقی نثر سنتے ہوئے یا پڑھتے ہوئے انسانی احساسات و جذبات متاثر ہو کر رد عمل دیتے ہیں۔ اس کی مثال شاعری، افسانہ، ناول وغیرہ شامل ہے۔ نثر نگاری کے جدید رجحانات سے ادبی نثر میں وسعت اور گہرائی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔

نثر کا معیار مختلف ادوار کے تہذیبی مزاج کے مطابق بدلتا ہے۔ نثر کا تمثیلی انداز جس میں علامتوں اور تمثیلوں کے ذریعے مضامین اور فلسفیانہ امور پیش کیے جاتے ہیں۔ شاعرانہ اور نیم شاعرانہ نثر بھی ہے۔ یہ ایک ادبی نثر کی صورت ہے جس میں قافیہ، ردیف اور ہم وزن الفاظ کی پیشکش ملتی ہے۔ نثر نگاری میں علمی، تخلیقی اور ادبی نثر کے مباحث سے جدید رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے۔ جدید نثر میں سادگی اور صراحت کو اہمیت حاصل ہے۔ بیان کی غیر ضروری آرائش کے بجائے سادگی اور صراحت کو قدر اول قرار دیا جاسکتا ہے۔ اردو نثر مختلف رجحانات اور تحریکوں کے ساتھ ارتقائی سفر طے کر رہی ہے۔ اردو نثر میں ادیب اپنے تصورات و خیالات کا اظہار مختلف قسم کے پیرائے میں کرتے ہیں۔ صاحب اسلوب ادیب کی پہچان اس کی نثر ہوتی ہے۔ اردو ادب کے اکابر کی نثر پر سرسری نظر ڈالی جائے تو اس فہرست میں مشتاق احمد یوسفی اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک ٹرینڈ ماسٹر کی حیثیت سے اردو زبان و ادب میں اپنی تحریروں کے ذریعے جانے جاتے ہیں۔ اردو ادب میں بطور ادیب مزاح نگاراور طنز نگار کے

ساتھ ساتھ ایک سماجی و فکری شخصیت کے حامل ہیں۔ اردو ادب میں چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آبِ گم اور شام شعر یاراں جیسی تخلیقات کی صورت میں نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

تخلیق کار اور فن پارے میں نفسیات کا عمل شامل ہوتا ہے۔ ایک طرف فن پارے میں خود ادیب کی نفسیاتی زندگی اور طبعی رجحان کا داخل ہونا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری جانب مصنف اپنے کرداروں کی نفسیات سے کام لے کر اپنے تخلیقی مقصد کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی مصنف کی نثر میں نفسیاتی عناصر کی تلاش و تعین کی کوشش کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کے اظہار کے طریقوں اور امکانات پر نظر ڈالی جاتی ہے اور واقعات کے پس پردہ محرکات کا نفسیاتی، سماجی اور سیاسی تناظر میں تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ کرداروں کے نفسیاتی مطالعے سے انسانی زندگی اور انسانی سماج میں ہونے والے واقعات کے عوامل کا گہرائی اور سنجیدگی سے تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی اور نفسیات کے آپس کے تعلقات کی نوعیت نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ نفسیات کا عمل دخل معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی عوامل کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر پڑتے ہیں۔ ادب انسانی زندگی اور انسانی سماج کی عکاسی کرتا ہے تو نفسیات انسانی کردار اور واقعات کا مطالعہ و تجزیہ کرتی ہے۔ ان اثرات سے ادیب متاثر ہو کر کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے۔ اپنے معروض میں ہونے والے سماجی و سیاسی حالات سے متاثر ہو کر ادیب موضوعات کا چناؤ کرتا ہے۔ ادیب کی تحریر میں مختلف رجحانات اور تحریکوں کے اثرات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد مشتاق احمد یوسفی اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت میں ایک خوش گوار اضافہ کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اردو مزاح میں ایک باقاعدہ مزاح، صاحب اسلوب کی حیثیت اور اپنی انفرادیت قائم کرتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ موضوعات میں تنوع ہے سماجی ناہمواریوں پر ایک متوازن اور معتدل زاویے سے تحریر لکھتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں سیاسی و سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی عناصر کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر پر غالب اور دیگر اکابر کے اثرات حاوی دکھائی دیتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی نثر کلاسیک اور ایک ٹرینڈ ماسٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو طنز و مزاح میں اپنی تحریروں کے ذریعے زندہ رہنے والے لکھاری کی حیثیت سے پہچان رکھتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی راجھستان کے قصبے ٹونک (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان کے والد کا نام عبدالکریم یوسفی اور والدہ کا نام

مسعود جہاں تھا۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے فلسفے میں ماسٹرز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے کراچی میں قیام پذیر ہوئے۔ عملی زندگی میں ملازمت کا آغاز مسلم کمرشل بینک سے کیا۔ یوں بینکاری کے شعبے کو ذریعہ معاش بنایا۔ اس بینک کے علاوہ دیگر بینکوں میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ بینک ملازمت کے حوالے سے زرگزشت میں لکھتے ہیں:

> "ہم نے جا کر انھیں خوش خبری سنائی کہ ہم بینکنگ کے پیشے میں حادثاتی طور پر داخل ہو گئے ہیں۔ دست بخیر! بینک کو چوٹ تو نہیں آئی؟ مبارکباد کے بجائے انھوں نے اسے اس صدی کا بھونڈا انداق قرار دیا۔ ہم نے کہا تمہیں یقین نہیں آتا ہم تو کل صبح سے بینک جانا شروع کر دیں گے۔ فرمایا "جب تک کوئی شخص نشے میں دھت نہ ہو تمہیں بینک میں ملازم نہیں رکھ سکتا۔ "جس شخص نے ہمیں ملازم رکھا وہ اسی عالم میں تھا۔"[1]

مشتاق احمد یوسفی اردو ادب کے ایک اہم مزاح نگار لکھاری ہیں۔ اپنی تحریر کی انفرادیت اور چاشنی کی وجہ سے اردو طنز و مزاح کے منظر نامے کو روشن کیا۔ اسلوب کی ندرت، تخیل کی بلندی اور فلسفیانہ آمیزش نے ان کو طنز و مزاح نگاری کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ یوں اردو مزاح کو ایک مضبوط بنیاد مہیا کی۔ مشاق احمد یوسفی نے اردو اور انگریزی ادب سے استفادہ کیا۔ اپنی تحریروں میں انگریز مصنفین کی آراء اور اردو ادب کے ادیبوں کی آراء اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ناقدین ادب نے یوسفی پر غالب کے اثرات کا دعوی کیا ہے۔ اپنی تحریروں میں تحریف نگاری اور پیروڈی کی تکنک استعمال کرتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے اردو ادب میں مزاح کی روایت میں قدم رکھا ہے۔ مزاح کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مشاق احمد یوسفی کی پہچان بحیثیت مزاح نگار کے طور پر مشہور ہے۔ حالانکہ یوسفی کا میلان تہذیبی اور سماجی موضوعات کی طرف حاوی ہے۔ تحریف لفظی میں لفظ کی معنویت، حرمت اور اس کے تہذیبی شعور کا خصوصی خیال رکھا ہے۔ واقعات اور الفاظ میں توازن کو برقرار رکھتے ہوئے لفظی تحریف سے مزاح کشید کیا ہے۔ اس لیے مشتاق احمد یوسفی کے بارے میں ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے کہا ہے کہ "ہم اردو مزاح کے عہد یوسفی میں جی رہے ہیں۔"[2]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں روانی اور جملہ سازی پر گرفت کا عنصر نمایاں ہے۔ منفرد نثر اردو زبان کی تمام کلاسیک نثری اسالیب کی بنیادوں پر استوار ہے جو کہ اب تک جدید کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ یوسفی مزاح لکھنے کے لیے

تصوراتی منظر کشی یا کردار نگاری کے محتاج بالکل بھی نہیں۔ کرداروں کے ذریعے سماجی موضوعات، نفسیاتی اور فلسفیانہ مباحث کو مزاح کے پیرائے میں قاری پر عیاں کرتے ہیں۔ یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر اقداری ناسٹلجیا کے تناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مزاح کا لبادہ اوڑھ کر ماضی کی یادوں کا ایک ایک ایسا ادا اس منظر دیکھنے کو مہیا کرتے ہیں کہ جس سے قاری کو ایک مہاجر کی ذہنی کیفیت سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ یوسفی کی نثر میں اقداری ناسٹلجیا مختلف کرداروں کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال "چراغ تلے" میں یوں سامنے آتی ہے۔

"آغا تلمیذ الرحمن چاکسوی سے تعارف ہوا۔ سنتے چلے آئے تھے کہ آغا اپنے بچپن کے ساتھیوں کے علاوہ، جو اب ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ کسی سے نہیں ملتے۔۔۔ جب لوگ چار گھنٹے فی میل کی رفتار سے سفر کرتے تھے اور رؤسا تک جمعہ کے جمعہ نہاتے تھے۔۔۔ اس کا منہ آغا نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ حضرت اس سنہری زمانے میں ایسی سڑی گرمی کہاں پڑتی تھی؟۔۔۔ قاعدہ ہے کہ کوئی دور اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ آج آپ اکبر اعظم کے دور کو یاد کر کے روتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اکبر کے عہد میں پیدا ہوتے تو علاؤ الدین خلجی کے وقتوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہوتے۔ اپنے عہد سے غیر مطمئن ہونا بجائے خود ترقی کی نشانی ہے۔"[۳۲]

قیام پاکستان کے بعد ادبی منظر نامہ ایک طرح سے ماضی کی یادوں کی بھینٹ چڑھتا ہے۔ ادیب معاشرے کا حساس طبقہ ہوتا ہے۔ اپنے اردو گرد کے حالات و سماجی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اپنے عہد کی عکاسی ان کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ تقسیم ہند کا تجربہ ایک اجتماعی تجربہ ہے۔ ہجرت، تقسیم اور غیر انسانی رویوں کی وجہ سے حساس طبقہ متاثر ہو کر ماضی کی یادوں میں چلا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ادب میں مختلف رجحانات زیر بحث آتے ہیں۔ ناسٹلجیا، رومانوی، علامتی رجحان، حقیقت نگاری، ترقی پسندی، اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر عصری رجحانات کا اظہار ادبی پیرائے میں کسی نہ کسی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اقداری ناسٹلجیا کے رجحان کو مشتاق احمد یوسفی کا ایک کردار اس کی نمائندگی یوں کرتا دکھائی دیتا ہے:

"کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول، بے روزگاری، بے گھری اس پر مستزاد اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو، مختلف زاویوں سے کھنچوالائے تھے "ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے" ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔" جن دفتروں میں مکان کے الاٹمنٹ کی درخواستیں دی تھیں۔ ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوتی استحقاق دکھاتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں" واسکٹ اور شیروانی کی

جیب میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ در حقیقت ان کا وزٹنگ کارڈ تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیا، کبھی دڑبے، کبھی کابک کہتے لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں بھی سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھلیں۔ احباب نے سمجھایا "فلیٹ ایک گھنٹے میں مل سکتا ہے کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو" مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے، وہ کہاں مانتے۔ مہینوں فلیٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے پیاسے، پریشان حال سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے اب بیٹی داماد کے ہاں مہمان رہنے کا عذاب بھی سہا۔ انسان جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے: ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔"[۴]

انسان اور وقت دونوں کی نوعیت اور فطرت ایک جیسی ہے۔ چلے جائیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے۔ یوں لگتا ہے کہ دونوں کا خمیر مسافر خانے کی مٹی سے بنا ہے۔ یہ دونوں اپنے پیچھے جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں وہ صرف یادیں ہیں۔ یاد انسانی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یادیں جو کہ ہمارا گزرا ہوا وقت اور اپنی چشم شوق سے دیکھے گئے مناظر ہیں۔ غریب ہو، دولت مند ہو، عام انسان یا کوئی خاص شخصیت یادیں ہر انسان کے لیے اس کا انمول خزانہ ہوتی ہیں۔ یادیں پرندوں کی مانند ہوتی ہیں جو کہ محبتوں کے فروغ اور نفرتوں کے خاتمے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یادیں بنیادی طور پر خود پر بیتا ہوا وقت اور دیکھے گیے مناظر ہیں۔ اس حوالے سے مشتاق احمد یوسفی آب گم کے مضمون "شہر دو قصہ" میں لکھتے ہیں:

" پیری میں، پرانی ضرب المثل کے مطابق، صد عیب ہوں یا نہ ہوں، ایک عیب ضرور ہے جو سو عیبوں پر بھاری ہے اور وہ ہے ناسٹلجیا۔ بڑھاپے میں آدمی آگے یعنی اپنی منزل نامقصود و ناگزیر کی جانب بڑھنے کے بجائے الٹے پیروں اس طرف جاتا ہے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ پیری میں ماضی، اپنی تمام مہلک رعنائیوں کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ بوڑھا اور تنہا آدمی ایک ایسے کھنڈر میں رہتا ہے جہاں بھری دوپہر میں چراغاں ہوتا ہے اور جب روشنیاں بجھا کر سونے کا وقت آتا ہے تو یادوں کے فانوس جگ مگ جگ مگ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں جیسے جیسے ان کی روشنی تیز ہوتی ہے، کھنڈر کی دراڑیں، جالے اور ڈھنڈار پن اتنے ہی زیادہ اجاگر ہوتے جاتے ہیں۔"[۵]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں مزاح کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مزاح کے پس منظر میں انسانی نفسیات اور فکری مباحث کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ناسٹلجیائی رجحان کی تکنیک کا استعمال یوسفی کی تحریر میں نمایاں طور پر دیکھا

جاسکتا ہے۔ یوسفی نے مروجہ ناسٹلجیائی رجحان میں مثبت اور منفی رویوں کی نشاندہی کی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ناسٹلجیا کو بطور موضوع بیان کیا ہے تو اس رجحان کے صرف ایک رخ کا احاطہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے خود پر ماضی کو حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ اسی طرح ہجرت کے تجربے کو صرف فسادات اور کرب کا مجموعہ قرار دے کر اس کا عذاب نہیں جھیل رہے ہیں بلکہ وہ ماضی کی اقدار، ماضی کا احیا اور ماضی کی روایات کا موجودہ عہد اور عصری رجحانات سے ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا کا ذکر خود یوسفی کی زبانی ہوتا ہے۔ "آب گم" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناسٹلجیا ہے۔ زمانی اور مکانی، انفرادی اور اجتماعی جب انسان کو ماضی، حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جوانی لیوا حملہ کسی بھی عمر میں بالخصوص بھری جوانی میں ہو سکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروئن دستیاب نہ ہو تو پھر اسے یاد ماضی اور فینٹسی میں جو تھکے ہاروں کی آخری پناہ ایک گونہ سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔۔۔ کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے۔ جو قوم جتنی پسماندہ، درماندہ اور پست حوصلہ ہو اس کو اپنا ماضی، معکوس اقلیدسی تناسب میں اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار اور ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتاً تھا بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سر نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے۔ ماضی تمنائی۔۔۔ ناسٹلجیا اسی لمحے کی داستان ہے۔"[۱]

یوسفی ماضی کی روایات سے وابستہ کرداروں کے ذریعے ناسٹلجیائی رجحان کے منفی اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جنریشن گیپ سے جو خلا جنم لیتا ہے اس کے اثرات انسانی رشتوں اور انسانی سماج پر جو پڑتے ہیں اس کے امکانی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چراغ تلے کے مضمون میں اس کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

> "وہ خلوص نیت سے اس دور کو کلجگ کہتے اور سمجھتے تھے جہاں کوئی نئی چیز، کوئی نئی صورت نظر پڑی اور انھوں نے کچ کچا کے آنکھیں بند کیں اور یاد رفتگاں کے اتھاسمندر میں غڑاپ سے غوطہ لگایا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کندھے پر ایک آدھ لاش لادے بر آمد نہ ہوئے ہوں۔ کہیں کوئی بات بار خاطر ہوئی اور انھوں نے "یادش بخیر" کہہ کر بیتے سے اور بچھڑی ہوئی صورتوں کی تصویر کھینچ کے رکھ دی۔"[۲]

انسانی رویوں میں توازن جب بگڑ تا ہے تو انسانی شخصیت میں عدم توازن سے بے ترتیبی کو فروغ ملتا ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان جب رویوں میں شدت اختیار کرتا ہے تو مکالمے کی فضا منجمد ہو جاتی ہے۔ اخلاقی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر کے ماضی کی تکرار پر زور دیا جاتا ہے۔ اپنی بات منوانے کے لیے حال کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ماضی کی روایات اور اقدار کے ساتھ شدت کے ساتھ وابستگی حال سے لاتعلقی کا باعث بنتی ہے۔ یہ رویوں میں تبدیلی جو کہ بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضوں اور رجحانات کے بدلنے سے تبدیلی کو یکسر حال کو برا کہنا ناسٹلجیائی رجحان کا منفی پہلو ہے۔ اس حوالے سے یوسفی چراغ تلے میں لکھتے ہیں:

"گزشتہ پندرہ بیس سال میں قطب مینار کی سیڑھیاں گھٹنے کے بجائے اور زیادہ اونچی ہو گئی ہیں اور اس کے ثبوت میں اپنے حالیہ سفر دہلی کا تجربہ ہانپ ہانپ کر بیان کرتے چونکہ ہم میں سے کسی کے پاس پاسپورٹ تک نہ تھا اس لیے اس منزل پر بحث کا پلہ ہمیشہ ان کے حق میں جھک جاتا۔۔۔ بکری کا گوشت اب اتنا حلوان نہیں ہوتا جتنا ان کے وقتوں میں ہوا کرتا تھا۔ ممکن ہے اس میں کچھ حقیقت بھی ہو مگر وہ ایک لمحے کو بھی یہ سوچنے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس میں دانتوں کا قصور یا آنتوں کا فتور بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ تاہم ان کا دعویٰ تھا کہ میرے لڑکپن میں سرولی آم خربوزے کے برابر ہوتے تھے۔ ہم نے کبھی اس کی تردید نہیں کی اس لیے کہ ہم اپنے گئے گزرے زمانے میں روازنہ ایسے خربوزے بکثرت دیکھ رہے تھے جو واقعی آم کے برابر تھے۔۔۔ اس کلجگ کا اثر جہاں اور چیزوں، خصوصاً اشیائے خورد و نوش پر پڑا وہاں موسم بھی اس کے چنگل سے نہ بچ سکا۔ اوائل جنوری کی ایک سرد شام تھی آغا نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا کیا وقت آلگا ہے! ورنہ بیس سال پہلے جنوری میں ایسی کڑاکے کی سردی نہیں پڑتی تھی کہ پنج وقتہ تیمم کرنا پڑے۔"[۸]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر و اقداری ناسٹلجیا اپنے موضوع کی نوعیت سے ایک اہم تناظر ہے۔ جس میں کرداروں کی نفسیات اور کرداروں کے ذریعے برتے گئے مباحث کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے ادب پر ماضی پرستی اور ناسٹلجیائی رجحان غالب نظر آتا ہے۔ اس ناسٹلجیائی رجحان کے پس منظر میں ہجرت، فسادات اور اپنوں سے دوری ہے تو وہاں دوسری جانب نئے ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور سماجی و معاشی مسائل کی وجہ سے لوگ اپنے گزشتہ عہد کی یادوں میں شعوری اور لاشعوری طور پر وابستہ نظر آتے ہیں۔ ہجرت کے تجربے کو تخلیق کاروں نے تلخ تجربے کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ ہجرت کے وقت غیر انسانی رویے، مفاد پرستی، ریاستی جبر

اور لوٹ کھسوٹ تو یہ ایسے ہزاروں مسائل ہیں جس سے دکھی انسانیت کے دکھوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اردو کے ناول نگار، افسانہ نگار اور سماجی شخصیات اس کرب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقداری ناسٹلجیا کے مباحث شروع ہوتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کے ہاں اس ہجرت سے متاثرہ کردار ایک اقداری ناسٹلجیا اور نفسیاتی اثرات کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے تلمیذ الرحمن "چراغ تلے"، قبلہ اور بشارت "آب گم" اور "زرگزشت" میں کردار عباد الرحمن قالب نمایاں ہیں۔ ان حالات کے شکار کرداروں میں موجودہ حالت بیان ہوئی ہے۔ اس حوالے سے یوسفی زرگزشت میں لکھتے ہیں:

> "عباد الرحمن قالب بلند شہری، ثم ٹونکی، ٹونک کے میونسپل کمیٹی میں متصدی تھے۔ مشاہرہ ۳۰ روپے چنور شاہی کہ جس کے ۲۰ روپے کلدار بنتے تھے مگر یہ نشہ کیا کم تھا کہ چار دانگ ٹونک میں کوئی کتا ان کی منشا کے بغیر بھونک نہیں سکتا تھا اور نہ کوئی پرنالہ ان کی منشا کے بغیر غلط جگہ گر سکتا تھا۔ اپنی متروکہ حویلی سے زیادہ اس شفیق نیم کو یاد کرتے جسے آنگن میں سر جھکائے تنہا کھڑا چھوڑ آئے تھے، کہتے تھے مکان کے عوض مجھے مکان الاٹ ہو گیا لیکن حکومت وہ نیم کہاں سے لائے گی جس کی چھاؤں میں نیند کی پریاں جھولا جھلاتی تھیں جس کے نیچے ایک بچے نے نبولیوں سے آم کی دکان لگائی تھی۔ جہاں بہنیں گڑیاں کھیلیں۔ شادی کی شہنائی بجی۔ باپ کا جنازہ رکھا گیا پھر اسی بوڑھے نیم کی سینک سوگوار ماں نے کانوں میں پہن لی۔ روایت ہے، اورنگزیب عالمگیر نے جب یہ خبر سنی کہ کشمیر کی تاریخی مسجد میں آگ لگ گئی ہے تو اس نے کہا مسجد تو دوبارہ تعمیر ہو جائے گی لیکن صحن مسجد کے چنار جل گئے تو ایک ہزار عالمگیر بھی ایک بوڑھا چنار نہیں پیدا کر سکتے۔ اب انھیں کون بتاتا کہ یادوں کے ایسے بوڑھے نیم تو ہر گاؤں، ہر دل کے آنگن میں سایہ فگن ہوتے ہیں۔ ہاں جب دل کی آگ بجھ جائے تو ان کی جڑیں شریانوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔"[۹]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر پر ماضی پرست اور ناسٹلجک کا لیبل چسپاں کرتے ہوئے آب گم کے مقدمے میں ان کی لکھی ہوئی تحریر بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ یوسفی کی نثر میں تہذیبی، سماجی اور فکری موضوعات مزاح کے پیرائے میں بیان ہوتے ہیں۔ یوسفی کے ناسٹلجک یا ماضی پرستی کے لیبل پر ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> "آب گم کے مطالعے کے بعد اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ اس کا موضوع Nostalgia ہے۔ اس کتاب کے چند اہم کرداروں کا حال کی تلخیوں اور ناکامیوں سے گھبرا کر ماضی کی تخیلی راحتوں اور عظمتوں میں پناہ لینے کا رویہ ناسٹلجک ماحول ضرور فراہم کرتا ہے۔ مگر یہ کتاب بنیادی طور پر ماضی پرستی کے گرد نہیں گھومتی بلکہ مشرقی اقوام کی اقتصادی، سیاسی اور

معاشرتی بدحالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کم حوصلگی، تہی دامنی اور بے عملی کا دردمندی اور دل سوزی سے جائزہ لیتی ہے۔ اور اگر صرف ایک ہی لفظ میں اس کے موضوع کو سمیٹا جاسکتا ہے تو پھر اس کتاب کا موضوع انسان اور اس کی زندگی ہے۔ درماندہ، خستہ حال، شکستہ دل، بچھڑی ہوئی، اکھڑی ہوئی، سسکتی اور بے ثمر فریاد کرتی زندگی۔۔۔ کیچڑ میں ملی، موتیوں کی سی آب و تاب والی، آس امید کی پتوار چلاتی، آگے بڑھتی زندگی۔۔۔۔ انتہائے غم کو حوصلہ مندی سے مسکرا کے ٹال دیتی زندگی۔۔۔۔ یہ بیسویں صدی کے گلوبل ولیج اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں وقت کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جانے والے دلوں کا مرثیہ ہے۔ تیز رفتار، جیٹ انجن اور بلٹ ٹرین کے پہیوں تلے کچلی ہوئی کسالت زدہ معاشرت کا نوحہ ہے۔ زندگی سے نظر چرا کر، خود اپنے اندر کوئی اور جہان آباد کر کے اس میں جینے والے الم نصیب لوگوں کا نغمہ خود پرستی ہے، یہ افلاطون کے اس غار کی تمثیل ہے جس میں ہر کوئی حقیقت کا صرف عکس دد یکھ پاتا ہے کیونکہ روشنی کی طرف اس کی پشت ہے، چہرہ نہیں۔"[۱۰]

مشتاق احمد یوسفی کی پہچان بطور مزاح کے ہوتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے پڑھنے والے دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کا مشہور پہلو بطور مزاح نگار ہے جب کہ دوسری جانب سنجیدہ فکری پہلو ہے کہ مزاح کے پیرائے میں سماجی تہذیبی اور ادبی موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ یوسفی نے شام شعر یاراں میں مزاح نگار کے حوالے سے لکھا ہے:

"لوگ مزاح نگار سے کوئی سنجیدہ بات سننے کے روادار نہیں۔۔۔ سبب یہ ہے کہ اگر کوئی اہل قلم مزاح نگار کہلانے لگے تو پھر خواہ وہ مرثیے یا المیہ ڈرامے لکھنے لگے یا حاکمان و صاحب امروز کا "روز ایک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ کہوں" نہ لکھے کہلائے گا مزاح نگار ہی۔[۱۱]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں مزاح سے المیہ کشید کرنے کا عنصر حاوی محسوس ہوتا ہے۔ یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر واقداری ناسٹلجیا کا محرک کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوتا یہ عمومی زندگی اور معاشرے میں عام کرداروں کے جذبات واحساسات کا بیان ہوتا ہے۔ کرداروں کی نفسیاتی وسماجی تجزیے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر اپنائیت سے کرداروں کے مکالمے کو زیر بحث لایا گیا ہے ۔کرداروں کے ذریعے ایک عہد کی عکاسی کی گئی ہے۔ روایات، اخلاقیات، علاقائی سوغاتیں، علاقائی لہجے، رہن سہن اور دیگر رسومات وعقاید کو اپنی تحریروں میں المیاتی تناظر میں سامنے رکھا ہے ۔آب گم کا "بشارت""حاجی اورنگزیب "اور زرگزشت کا "خان سیف الملوک"۔یوسفی کی زبانی ان کے مابین جذباتی مکالمے پڑھنے کو ملتے ہیں۔

تعلق کوئی بھی ہو اس سے دور ہوتے ہوئے انسان دکھی ہو جاتا ہے یوں بھی ملنا آسان اور بچھڑنا مشکل ہوتا ہے۔ بچھڑنے پر پھر سے ملاقات نہ ہونے کا خوف! انسان کا بنیادی مسلہ خوف ہی تو ہے۔نہ ملنے کا خوف، مل گئے تو بچھڑنے کا خوف۔ بچھڑنے کا خوف بڑا ظالم ہوتا ہے۔جدائی تو الگ اذیت ہے۔جدائی کا احساس زندہ انسان کو مار دیتا ہے۔جدائی تو کوئی بھی برداشت کرلیتا ہے۔جدائی کا احساس انسان کو بے بس کر دیتا ہے۔مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں اس المیاتی اور ناسٹلجیائی رجحان کو ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے انسان اس کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔"حاجی اور نگزیب" اور "بشارت" کے مابین تعلق اس کی واضح مثال ہے

"خان صاحب کے جانے کے کوئی چھ سات ہفتے بعد ان کا املا کرایا ہوا ایک خط موصول ہوا۔لکھا تھا کہ "بفضل خداوندی یہاں ہر طرح سے خیریت ہے۔دیگر احوال یہ کہ میں نے اپنے دوران قیام میں آپ کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ناحق آپ تردد کرتے اور صحبت کا سارا لطف کر کرا ہو جاتا۔پشاور سے میری روانگی سے تین ہفتے پیشتر ڈاکٹروں نے مجھے جگر کا سروسس بتایا تھا۔ دوسرے درجے میں، جس کا کوئی علاج نہیں۔جناح ہسپتال والوں نے بھی یہی تشخیص کی۔ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہر وقت اپنا دل پشوری کرتے رہو۔خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو جن کی صحبت تمہیں بشاش رکھے۔بس یہی تمہارا علاج اور خوگ ژوند (میٹھی زندگی) کا نسخہ ہے۔یارا جی! میں بچہ نہیں ہوں۔جو انھوں نے کہا وہ میں سمجھ گیا اور جو نہیں وہ میں بخوبی سمجھ گیا۔یہ مشورہ تو مجھے کوئی طبلہ بجانے والا بھی مفت دے سکتا تھا۔اس کے لئے ایم آر سی پی اور ایف آر سی ایس ہونے اور جگہ بے جگہ ٹونٹی لگا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

"میں نے لنڈی کوتل سے لانڈھی تک نگاہ ڈالی۔آپ سے زیادہ محبتی، خود خرسند رہنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ نظر نہیں آیا۔چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آ گیا۔باقی جو کچھ ہوا وہ طبیعت کا زنگ اتارنے کا بہانہ تھا۔جتنے دن آپ کے ساتھ گزرے اتنے دنوں سے میری زندگی بڑھ گئی۔خدا آپ کو اسی طرح شادمان اور مجھ پر مہربان رکھے۔آپ کو میری وجہ سے جو تکلیف ہوئی اس کی معافی مانگنا لکھنوی تکلفات میں شامل ہو گا، جو مجھ جیسے جاہل کے بس کا کام نہیں۔مگر دوستی میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔میرا دادا کہتا تھا کہ فارسی میں ایک مثل ہے کہ یا تو ہاتھی بانو سے دوستی مت کرو۔اور اگر کرلی تو۔ پھر اپنا مکان ایسا بنواو جو ہاتھیوں کے ٹکر سہ سکے۔۔۔۔۔۔اس بیماری کا خانہ خراب ہو۔عمر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی چھلکا جا رہا ہے۔خط لکھوانے میں بھی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ڈر کے مارے ٹھیک سے کھانس بھی نہیں سکتا۔آپ کی بھابی رونے لگتی ہے۔مجھ سے چھپ کر وقفے وقفے سے گرج چمک کے ساتھ اشک باری کرتی ہے۔بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ بختاور! جب تک بالکل بے ہوش نہ ہو جاوں، میں بیماری سے ہار نہ ماننے والا

آدمی نہیں۔بشارت بھائی!ایسے آدمی کے لئے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔گزشتہ ہفتے یونیورسٹی روڈ پر ایک نیا مکان بنوانا شروع کر دیا ہے۔دالان میں پشاور کے پچاس یا کراچی کے سو شاعروں کے دوزانو بیٹھنے کی گنجائش ہوگی۔۔۔۔آپ کا چاہنے والا کابلی والا۔۔۔۔۔اب نئے مکان اور دالان کا انتظار کون کرے۔میں نے آپ کے لئے سردست ایک عدد بے چھید چاندنی اور پانچ شاعروں کا انتظام کر لیا ہے۔والسلام۔بشارت پہلی ٹرین سے پشاور روانہ ہو گئے۔"[۳۱]

موسم کے ساتھ کھلنے والے پھول، پودے اور جذبات مخصوص موسم کے گزرتے ہی دم توڑ جاتے ہیں لیکن انسانی رویوں پر اس کے اثرات تادیر محسوس ہوتے ہیں۔یوسفی کی نثر میں نفسیاتی واقداری ناسٹلجیا کرداروں کے ذریعے ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جس میں تصور غم اور ماضی کی یادیں مزاح کے پیرائے میں میں انسانی جذبات واحساسات کی ایک فلم تصاویر کی صورت میں سامنے آتی ہے۔یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر واقداری ناسٹلجیا یادوں کی ایک البم کا منظر پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔اس کی عکاسی یوسفی کی کتاب "زرگزشت"میں خان سیف الملوک اور یوسفی کے مکالمے کے ذریعے دیکھنے کو ملتی ہے۔اس کا بیان "زرگزشت"میں یوں ہوتا ہے۔

"وقت نے کیسی عمارت ڈھائی تھی۔دوبارہ آنکھ بھر کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔بہت سوچا،کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں۔آخر یہ مشکل انہوں نے آسان کر دی۔کہنے لگے "ہائے !یوسفی صاحب!یہ آپ کو کیا ہو گیا؟وہ ہمارا دلدار کہاں گیا؟ہم نے کہا" آپ نے بڑی زحمت کی ۔"میں کار بھیج کر بلوالیتا۔"۔۔۔۔پوچھا آج کل کیا شغل ہے؟بولے اسی برگ حرام کی کاشت کی تھی۔۔۔۔۔ہم نے آنکھ کے آپریشن پر اظہار افسوس وہمدردی کیا تو دوسری آنکھ سے مسکراتے ہوئے بولے "جی ہاں!میری آنکھیں اب اتنی کمزور ہو گئی ہیں جتنی آپ کی تیس پہلے تھیں!"کچھ دیر بعد انہوں نے ایک ٹرے سے خوان پوش ہٹایا۔کہنے لگے" آپ کے لئے ریتالایا ہوں۔بیٹی نے ساری رات جاگ کر پکایا ہے۔"اور بھابی۔۔۔۔؟"انہوں نے مضبوطی سے ابدالی کو تھاما اور سر جھکا لیا۔ہمیں اپنے سے زیادہ دل گرفتہ دیکھ کر کہنے لگے "ماوے چہ زہ بہ در تا جاژم تہ دبیدیانہ ستڑے سرے راورے ماینہ (میں تو تمہارے پاس رونے کو آیا تھا۔مگر تمہاری آنکھیں تو پہلے ہی سرخ ہیں)یہ آپ کو کیا ہو گیا؟آدھ گھنٹہ گزر گیا۔آپ نے ایک مصرع تک نہیں پڑھا۔کوئی شعر سنائے۔جی بہت اداس ہے۔"وہ باتیں،وہ راتیں سب خواب وخیال ہوئیں۔وہ جوان مر گیا ۔اب تو آپ سنائے""خاوندہ ماگل دہ گلاب کڑی چہ دہ جانان پہ غیگ کی پانڑے پانڑے شمہ (اے خدا!مجھے گلاب کا پھول بنادے کہ میں محبوب کی آغوش میں پتی پتی ہو کر بکھر جاوں)رخصت ہونے لگے تو ملیشیا کی قمیص پر موتیوں کی مالا بکھر گئی۔ابدالی پر سر ٹیک کر کہنے لگے "بچے سب گھر بار کے ہوئے۔وقت ناقت ہوا چاہتا ہے۔منزل اب دور نہیں۔۔۔۔زندگی نے انہیں کیا دیا؟کچھ بھی تو نہیں۔مگر ہاں،جینے کا ایک نرالا بانکپن۔ہر حال میں خوش رہنے اور خوش

رکھنے کا حوصلہ۔یادوں اور باتوں کے ان اوراق کو پلٹ کر دیکھا تو خود چونک پڑا۔۔۔زندگی کو انہوں نے کیا دیا؟اب جو غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی تنگی، اتنی محرومی اور ایسی تنہائی کے باوجود کتنے مطمئن و مسرور تھے۔کتنی خوشیاں، کیسی کیسی خوشبوئیں بکھیرتے چلے گئے کہ آج دامن میں نہیں سماتیں۔پھول جو کچھ زمین سے لیتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اسے لوٹا دیتے ہیں۔"[۱۳]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی واقداری ناسٹلجیا سمیت دیگر فکری مباحث کی طرف ڈاکٹر عزیز ابن الحسن اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"میرے اعتبار سے یہی معاملہ یوسفی کا ہے۔انہوں نے مزاح کی شکر لگی گولی کو اپنی نثر نگاری، جزرسی، اپنی زبان دانی، لفظ شناسی اور شعور حیات کے بیان کے لیے بطور چارے کے استعمال کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فن میں جوں جوں پختگی آتی گئی وہ مزاح کے بجائے الم نگار بنتے گئے تھے۔اس شئے کی شہادت ان کی کتاب "آب گم" میں سب سے زیادہ ہے۔" [۱۴]

یوسفی کی نثر میں کرداروں کی نفسیات اور ان کا معاشرے کے عام انسانوں سے جو ربط ہے وہ سماجی زندگی کا نمونہ اظہار ہے۔یوں لگتا ہے جیسے ان کرداروں کے ذریعے وہ معاشرے کی سماجی ناہمواریوں اور بے قاعدگی پر مکالمہ کر رہے ہیں۔یوسفی کی نثر میں مزاح کے ساتھ ساتھ فکری رچاو پایا جاتا ہے کرداروں کے ذریعے ناسٹلجیائی رجحان کے دونوں پہلوؤں کو دکھایا جاتا ہے۔ناسٹلجیا کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو بیان کرتا ہے انسانی جذبوں میں عدم توازن سے جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اس کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ماضی کی روایات اور اقدار کی پامالی کوئی برائی نہیں لیکن حال کو یکسر نظر انداز کر کے ماضی میں پناہ لینا کوئی صحت مند رویہ بھی نہیں۔اس کی طرف اشارہ "چراغ تلے" میں یوں ہوتا ہے۔

"اپنا تو عقیدہ ہے کہ جسے ماضی یاد نہیں آتا اس کی زندگی میں شاید کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔لیکن جو اپنے ماضی کو یاد ہی نہیں کرنا چاہتا وہ یقینا لوفر رہا ہو گا۔کیا سمجھے؟ ماضی ہی اٹل حقیقت ہے۔۔۔آنے والا کل آج میں اور آج گزرے ہوئے کل میں بدل جاتا ہے اس پر پہلے درویش نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ ایشیا کا حال اس شخص جیسا ہے جس نے گئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی۔۔۔بیتی ہوئی گھڑیوں کی آرزو کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹوتھ پیسٹ کو واپس ٹیوب میں گھسانا!لاکھ یہ دنیا ظلمت کدہ سہی لیکن کیا اچھا ہو کہ ہم ماضی کے دھندلے خاکوں میں چیختے چنگھاڑتے رنگ بھرنے کے بجائے حال کو روشن کرنا سیکھیں۔"[۱۵]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں موضوعات کا تنوع اور وسعت پائی جاتی ہے۔یہ موضوعات کسی بھی انسانی زندگی کے ایک پورے نظام حیات، رویوں اور احساسات وجذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔یوسفی کی نثر پڑھتے ہوئے بعض اوقات یوں

محسوس ہوتا ہے کہ ایک موضوع پڑھتے چلے جا رہے ہیں لیکن ذہن میں اس متعلق دیگر دریچے بھی کھلتے جاتے ہیں۔یوسفی کی نثر میں فکری، موضوعاتی، سماجی اور نفسیاتی عناصر کی پیش کش ایک اہم حوالے کی صورت اختیار کرتی ہے۔یوسفی اپنی کتاب "آب گم" میں لکھتے ہیں کہ

" ہر شخص کے ذہن میں عیش و فراغت کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو دراصل چربہ ہوتا ہے اس ٹھاٹ باٹ کا جو دوسروں کے حصے میں آیا ہے۔لیکن جو دکھ آدمی سہتا ہے، وہ تنہا اس کا اپنا ہوتا ہے بلا شرکت غیرے۔بالکل نجی، بالکل انوکھا۔ہڈیوں کو پگھلا دینے والی جس آگ سے وہ گزرتا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں۔جیسا داڑھ کا درد مجھے ہو رہا ویسا کسی اور کو نہ کبھی ہوا نہ ہوگا۔اس کے برعکس، ٹھاٹ باٹ کا بلوپرنٹ ہمیشہ دوسروں سے چرایا ہوا ہوتا ہے۔"[۱۶]

یوسفی کی نثر میں مزاح کے ساتھ ایک حسی ادراک کا جذبہ وابستہ ہے جو پڑھنے والے کو اپنے جانب متوجہ کرتی ہے۔مضمون "سکول ماسٹر کا خواب" آٹھ ذیلی عنوانات پر تقسیم ہے اس میں "بشارت" کردار کے ذریعے انسانی جذبات، احساسات اور رویوں کا ایک ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے جس میں ہر انسان کو اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔بشارت فیوڈل فینٹسی، حقیقی دنیا اور معاملات میں ایک متوازن رویہ پیش کرتا ہے۔کھلونوں کی مثال کی صورت میں یوں بیان ہوتا ہے:

"کھلونا ٹوٹنے سے بچے نے روتے روتے اچانک روشنی کی طرف دیکھا تھا تو آنسو میں دھنک جھلمل جھلمل کرنے لگی تھی۔پھر وہ سبکیاں لیتے لیتے سو گیا تھا۔وہی کھلونا بڑھاپے میں کسی جادو کے زور سے اس کے سامنے لاکر رکھ دیا جائے تو وہ بھونچکا رہ جائے گا کہ اس کے ٹوٹنے پر بھی بھلا کوئی اس طرح جی جان سے روتا ہے۔یہی حال ان کھلونوں کا ہوتا ہے جن سے آدمی زندگی بھر کھیلتا رہتا ہے۔ہاں، عمر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدلتے اور بڑے ہوتے رہتے ہیں۔کچھ کھلونے خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں۔کچھ کو دوسرے توڑ دیتے ہیں۔۔۔۔پھر ایک ابھاگن گھڑی ایسی آتی ہے جب وہ ان سب کو توڑ دیتا ہے۔اس گھڑی وہ خود بھی ٹوٹ جاتا ہے"[۱۷]

یادیں انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں اور انسانی زندگی کا جواز بھی۔تقریبا ہر آدمی اپنی یادوں کا اسیر ہوتا ہے۔سماجی، معاشرتی، ثقافتی اور ادبی طور پر بھرپور زندگی گزارنے والے یوسفی کی نثر میں ان پہلووں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ان یادوں میں بہت سی یادیں حسین ہیں تو بہت انتہائی تلخ۔یوں لگتا ہے کہ یوسفی کی نثر میں حسین یادوں کی روشنی میں زندگی کے نئے نئے راستے دریافت کئے ہیں اور تلخ یادوں سے قوت حاصل کی ہے۔ان تلخ اور حسین یادوں کی مثال میں "چراغ تلے" میں "یادش بخیر" اور "آب گم" میں مضمون حویلی کی صورت میں ایک جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔یوسفی نے اپنی نثر میں مختلف رجحانات اور رویوں کو دکھایا ہے۔انسانی زندگی اور انسانی رویوں میں توازن

قائم رکھنا گو کہ مشکل ہے۔ انسان زمانے کے بدلتے رجحانات اور چیلنجز کے ساتھ اپنی بقا کی بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ جب انسان حال، ماضی اور مستقبل میں توازن کھوتا ہے تو یہ رویہ انسان اور انسانی معاشرے کے لئے مفید ہونے کے بجائے نقصان کا سبب بنتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا اور یادیں جب کرداروں کے ذریعے زیر بحث آتی ہیں تو اس کے دونوں رویوں مثبت اور منفی رویوں کو قاری پر عیاں کیا جاتا ہے کہ انسان یادوں کے حصار میں مبتلا ہو کر جب حال سے لاتعلقی اور کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ نئی نسل اور موجودہ اقدار کی نفی کر کے دراصل ایک تخریبی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے۔ وقت بدلنے سے انسانی رویوں، تصورات اور نظریات میں تبدیلی آتی ہے۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ صحت مند رویہ ہی انسانی زندگی کی بقا ہے۔ یوسفی روایتی معنوں میں ناسٹلجیا ماضی کو یاد کر کے صفحات نہیں بھرتا ہے بلکہ اس ماضی کے بیان سے جدید نسل کیا سوچتی ہے؟ ماضی کے ذکر کو سنتے اور پڑھتے ہوئے نئی نسل اس سے کیا نتائج اخذ کرتی ہے۔ اور ماضی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیسے کرتی ہے؟ ان رویوں اور جذبات کو یوسفی نے کرداروں کے ذریعے مکالماتی انداز میں بیان کیا ہے جو کہ اقداری ناسٹلجیا کا ایک حوالہ ہے "چراغ تلے" میں لکھتے ہیں

> "گزشتہ پندرہ بیس سال میں قطب مینار کی سیڑھیاں گھسنے کی بجائے اور زیادہ اونچی ہو گئی ہیں۔ اور اس کے ثبوت میں اپنے حالیہ سفر دہلی کا تجربہ ہانپ ہانپ کر بیان کرتے۔ چونکہ ہم میں سے کسی کے پاس پاسپورٹ تک نہ تھا، اس لئے اس منزل پر بحث کا پلہ ہمیشہ ان کے حق میں جھک جاتا ۔۔۔۔ بکری کا گوشت اب اتنا حلوان نہیں ہوتا جتنا ان کے وقتوں میں ہوا کرتا تھا۔ ممکن ہے اس میں کچھ حقیقت بھی ہو مگر وہ ایک لمحے کو بھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہ تھے کہ اس میں دانتوں کا قصور یا آنتوں کا فتور بھی ہو سکتا ہے۔"[۱۸]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کا ذکر ان کے ہاں بھوت بن کر نہیں اترتا۔ ماضی کی بازیافت، اخلاقیات، اقدار اور مٹی ہوئی روایات کا ذکر ضرور کرتے ہیں لیکن اس میں توازن ضرور برقرار رکھتے ہیں۔ غالباً اس لئے یوسفی نے اپنے اوپر ماضی پرست یا ناسٹلجیک کا لیبل نہیں لگایا۔ یوسفی کو ماضی پرست قرار دینے والے ناقدین ادب یوسفی ہی کی کتاب سے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ یوسفی نے اپنے کرداروں کے ذریعے ماضی پرستی یا ناسٹلجیائی رجحان کے مثبت اور منفی رویوں کو سامنے رکھا ہے۔ روایتی معنوں میں ناسٹلجیائی رجحان کے تحت جو فن پارے لکھے گئے ہیں اس میں ماضی کی تکرار اور ماضی کی بازیافت ایک حد سے تجاوز اختیار کرتی ہے۔ ناقدین ادب اس حوالے سے انتظار حسین کی تحریروں کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یوسفی کے ہاں ناسٹلجیائی رجحان کرداروں کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے۔ یوسفی کی نثر میں یہ رویہ صرف ماضی کی اہمیت پر زور نہیں دیتا بلکہ حال کے ساتھ مکالمے کی صورت بھی پیش آتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ حد سے زیادہ ماضی پر زور دے کر حال سے فرار کا ایک حربہ ہے اس عدم توازن کی

مثال یوسفی اپنے کرداروں کے ذریعے سامنے لاتا ہے "چراغ تلے" کے یادش بخیر اور "آب گم" کے مضمون "حویلی" کے کرداروں کے ذریعے ناسٹلجیائی رجحان کی عکاسی کرتے ہے "آب گم" میں وہ "قبلہ" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"اکثر خیال آتا ہے، اگر فرشتے انھیں جنت کی طرف لے گئے جہاں موتیا دھوپ ہوگی اور کاسنی بادل، تو وہ باب بہشت پر کچھ سوچ کر ٹھٹک جائیں گے۔ رضوان جلد اندر داخل ہونے کا اشارہ کرے گا تو وہ سینہ تانے اس کے قریب جاکر کچھ دکھاتے ہوئے کہیں گے: "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"[19]

اسی طرح یوسفی "چراغ تلے" میں "آغا تلمیذ الرحمن چاکسوی" کی ماضی پرستی کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں

"نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ جنت میں بھی خوش نہیں ہوں گے اور یادش بخیر کہہ کر جنتیوں کو اسی جہان گذراں کی داستان پاستاں سنا سنا کر للچاتے ہوں گے جسے وہ جیتے جی دوزخ سمجھتے رہے۔"[20]

ہجرت کے واقعات، تقسیم ہندوستان کے وقت فسادات اور دیگر سماجی ناہمواریوں پر ادب لکھا گیا ہے۔ لیکن یوسفی نے اپنے ہجرت کے تجربے کو جس زاویے سے بیان کیا ہے وہ انتہائی دلچسپ ہے۔ وطن کی مٹی سے محبت اور بچپن کی یادیں۔ یہاں پر یوسفی نے اپنے اوپر ماضی پرستی کو حاوی نہیں ہونے دیا ہے بلکہ اعتدال پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک نئے ماحول کو قبول کرتے ہوئے اپنے ماضی کی یادوں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"وہ صبح نہیں بھولے گی جب ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل "پاکستان" لکھا نظر آیا تو اسے ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھا تھا۔ پھر مٹی اٹھا کر دیکھی۔ اسلام علیکم کہتے ہوئے سندھی ساربان دیکھے۔ ہندوستان کی نوٹ پر پہلی دفعہ حکومت پاکستان چھپا ہوا دیکھا۔ اور پھر ریگزار راجھستان میں پرکھوں کی قبریں، وہ بولی جو ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے، خیر گی امروز میں دھندلاتے چلے گئے۔"[21]

مشتاق احمد یوسفی ہجرت کرکے کراچی میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ راجھستان اور ٹونک کی یادوں کی جھلک ان کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یوسفی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ماضی کی یادوں کو یاد کرتے ہوئے ایک معتدل رویہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ حال کو نظر انداز کرکے ماضی کی یادوں میں پناہ نہیں لیتے۔ کسی موقع کی نسبت سے ماضی کا حوالہ ایسے دیتے ہیں جس میں اپنی روایات واقدار کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اقداری ناسٹلجیائی کیفیت کا اظہار زرگزشت میں کرداروں کے مکالمے کے ذریعے کچھ یوں کرتے ہیں۔

"آپ کا من ابھی تک میرا بائی کے دیس میں اٹکا ہوا ہے، پنڈت یوسفی! ریت کے ٹیلے، بنجر زمین، اونٹ، حد یہ کہ ڈھور، ڈھور ڈھور دیکھ کر آپ ناسٹلجک، ہو جاتے ہیں! آپ کے دیس جے پور میں نے

دے کے ایک جھیل تھی۔ سانبھر جھیل۔ اور یہ سڑاندی کھاری جھیل ہے جو سارے ہندوستان کو نمک سپلائی کرتی ہے۔ آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ برہمنوں کا دھرم اپنی رسوئی میں مسلمان کے تھاپے ہوئے اپلے جلانے سے بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ پاکستان کا دانا پانی کھاتے اتنے دن ہو گئے۔ مگر اب بھی وہی رٹ " میں چنے مٹر کے کھالوں گی تو لے چل جمنا پار"، تھان ہے تھان! یہ پاکستان ہے۔ آپ بھی کسی پولی، پلپلی، پوپلی زمین کو یاد کرتے ہیں۔"[۲۳]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں مزاح کے ساتھ ساتھ سماجی موضوعات میں اقداری مباحث نمایاں ہیں۔ اقدار کی پامالی یا زوال پذیری کو براہ راست موضوع بناتے ہیں۔ یہ اقدار سماجی، سیاسی، اخلاقی، معاشرتی، ثقافتی، معاشی، مقامی اور آفاقی ہی کیوں نہ ہوں۔ یوسفی اپنی نثر میں اقدار کی زوال پذیری کو ایسے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں سماجی اقدار کی پامالی اور زوال پذیری کا اظہار " آب گم " کے مضمون " اسکول ماسٹر کا خواب " میں ایک کردار مولوی کرامت حسین کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک شخص کا نقشہ نہیں کھینچا گیا ہے بلکہ سماجی اقدار کی پامالی اور اس طبقے کی اقداری شکست کو یوں پیش کیا ہے۔

" وہ دل ہی دل میں مولانا کو ڈانٹنے کا ریہرسل کرتے ہوئے آئے تھے۔ " یہ کیا اندھیر ہے، مولانا؟ کچکچا کر مولانا کہنے کے لئے انہوں نے بڑے طنز و تلخی سے وہ لہجہ کمپوز کیا تھا جو بہت سڑی گالی دیتے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن جھگی اور کیچڑ دیکھ کر انھیں اچانک خیال آیا کہ میری شکایت پر اس شخص کو بالفرض جیل ہو جائے تو اس کے تو الٹے عیش آجائیں گے۔ مولانا پر پھینکنے کے لئے طعن و تشنیع کے جتنے پتھر وہ جمع کر کے لائے تھے، ان سب پر داڑھیاں لگا کر جانمازیں لپیٹ دی تھیں تا کہ چوٹ بھلے ہی نہ آئے، شرم تو آئے۔ وہ سب دھرے رہ گئے۔ ان کا ہاتھ شل ہو گیا تھا ۔ اس شخص کو گالی دینے سے فائدہ؟ اس کی زندگی تو خود ایک گالی ہے۔ ان کے گرد بچوں نے شور مچانا شروع کیا تو سلسلہ ملامت ٹوٹا۔ انھوں نے ان کے نام پوچھنے شروع کیے۔ تیمور، بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگزیب۔ یااللہ! پورا دودمان مغلیہ اس ٹپکتی جھگی میں تاریخی تسلسل سے ترتیب وار اترا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مغل بادشاہوں کے ناموں کا اسٹاک ختم ہو گیا مگر اولادوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔۔۔۔ مولانا خدا جانے بشارت کو دیکھ کر بوکھلا گئے یا اتفاقاً ان کی کھڑاوں اینٹ پر پھسل گئی، وہ دائیں ہاتھ کے بل جس میں دم کے پانی کا گلاس تھا، گرے۔ ان کا تہمد اور داڑھی کیچڑ میں لت پت ہو گئی اور ہاتھ پر کیچڑ کا موزہ سا چڑھ گیا۔ ایک بچے نے بدقلعی لوٹے سے پانی ڈال کر ان کا منہ ہاتھ دھلایا، بغیر صابن۔۔۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب شکایت و فہمائش کا آغاز کہاں سے کریں۔ اسی شش و پنج میں انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ سے، جس سے ذرا دیر پہلے بہ کراہت مصافحہ کیا تھا، ہونٹ کھجایا تو ابکائی آنے لگی۔ اس کے بعد انہوں نے اس ہاتھ کو اپنے جسم اور کپڑوں سے ایک بالشت دور رکھا۔۔۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ میں آپ کے کوچوان

رحیم بخش سے پیسے لیتا رہا ہوں پڑوسن کے بچی کے علاج کے لئے۔۔۔ میرے والد کے کولھے کی ہڈی ٹوٹے دو سال ہو گئے۔ وہ سامنے پڑے ہیں۔ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ چارپائی کاٹ دی ہے۔ مستقل لیٹے رہنے سے ناسور ہو گئے ہیں۔"[۲۳]

جھگی والے انسانوں کی کہانی ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک انسانی المیے کو زیر بحث لاتے ہوئے ایک حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں یوسفی کی نثر میں مزاح کے پس منظر میں نفسیاتی عناصر اور ایک طبقے کی اقدار کی زوال پزیری کو بیان کیا ہے۔ ان سماجی ناہمواریوں کو دیکھنے کے بعد انسان کی حالت کیا ہوتی ہے اس کیفیت کا اظہار "آب گم" میں یوں ہوتا ہے

"مولانا کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی اور وہ معذرت کر کے کچھ دیر کے لئے اندر چلے گئے۔ ادھر بشارت اپنے خیالات میں کھو گئے۔ اس ایک آر پار جھگی میں جس میں نہ کمرے ہیں نہ پردے، نہ دیواریں نہ دروازے، جس میں آوازیں اور سوچ تک ننگی ہے، جہاں لوگ شاید ایک دوسرے کا خواب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ایک کونے میں بوڑھا باپ دم توڑ رہا ہے۔ دوسرے کونے میں زچگی ہو رہی ہیں۔ بھائی میرے! جہاں اتنی رشوت لی تھی وہاں تھوڑی سی اور لے کر بیوی کو اسپتال میں داخل کرا دیتے تو کیا حرج تھا۔"[۲۴]

یوسفی کی نثر میں موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ موضوعات میں تنوع ہے۔ یوسفی کو صرف اردو ادب میں مزاح نگار تک محدود کرنا ناانصافی ہے یوسفی کے کردار مولوی کرامت حسین کے بارے میں سید مظہر جمیل لکھتے ہیں کہ

"مولوی کرامت حسین کا کردار دراصل مشتاق احمد یوسفی کی ان تہذیبی اقدار کا نمائندہ کردار ہے جو یورش آلام میں بھی شکست خوردگی سے محفوظ رہتا ہے اور افلاس کی زیریں سطح پر بھی مطمئن اور شکر گزار نظر آتا ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو زندگی کو "جیسی ہے اور جہاں ہے" کی بنیاد پر قبول کرتا ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو انسان دوست اور توقیر آشنا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ان سلگتے ہوئے انسانی آشوب اور مصائب کو جس دردمندی اور خلوص کے ساتھ لکھا ہے وہ ان کے انسان آشنا اور انسان دوست رویے کا مظہر ہے کہ اس طرح کے دھڑکتے ہوئے مناظر کسی ایسی نثر کا کب مقدور ہو سکتے ہیں جہاں صرف لفظوں کی رنگین آتش بازی اور پھلجڑیاں ہی اڑائے جاتی رہی ہوں، بلکہ اس طرح کا اظہار دھڑکتی ہوئی زندگی کو انسانی احساس کی سطح پر محسوس کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کو ہم ایک ایسے "سنجیدہ ظرافت نگار" کے طور پر جانتے اور مانتے ہیں، جو معاشرتی صورت حال کو ژرف نگاہی سے دیکھ لینے اور انسان احساس و جبلت کی تہوں تک اتر جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ المیہ صورت حال سے بھی ایک ایسا زہر خند کشید کر لینے پر قادر ہیں جو انسان میں جذباتی رقت کی بجائے انسان دوستی سے مملو دردو گداختگی کا جوہر پیدا کرتا ہے"[۲۵]

انسان کیسے بھول سکتا ہے وہ گلیاں اور وہ محلہ جہاں اس نے بچپن گزارا ہو۔ یادیں پرانی نہیں ہوتیں نہ ہی ان کو زنگ لگتا ہے یہ تو تیز ہوا جھونکا ہے جو کہ بار بار پلٹ کر آتی ہیں ہر بار ایک نیا احساس، نئے معنی اور نئے رنگوں کے ساتھ تازگی کی وجہ بنتی ہے۔ یادیں انسان کو سوچنے اور تفکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یادیں کھوئے ہوئے وقت اور آنے والے وقت میں رابطہ قائم کرتی ہیں۔ یادیں انسانی مزاج میں جمالیاتی حسن کو فروغ دیتی ہے یادوں کے ذریعے ماضی سے آگاہی ملتی ہے۔ یادیں انسان کو حال اور ماضی کے مابین امکانات کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ ماضی کا ادراک ،ماضی میں ہونے والی اجتماعی اور انفرادی غلطیوں سے سیکھنے کا جواز پیدا کرتی ہے۔ ماضی کو ایک حد تک یاد رکھا جائے تو ٹھیک ہے لیکن اگر توازن بگڑ تا ہے تو مشتاق احمد یوسفی اس کے متعلق "آب گم" میں لکھتے ہیں کہ

> " کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا ولن ماضی ہے۔ جو قوم جتنی پسماندہ، درماندہ اور پست حوصلہ ہو، اس کو اپنا ماضی، معکوس اقلیدسی تناسب۔۔۔ میں، اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار اور ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے۔ اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتاً تھا، بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سر نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے۔ ۔۔۔ماضی تمنائی" [۲۶]

اقداری ناسٹلجیا میں انسان اپنے ماضی کی اجتماعی صورت حال کو یاد کرتا ہے ایک ایسا نظام حیات جو کہ اقداری خصوصیات کا نمائندہ تھا لیکن وقت کے بدلنے، نئے دور کے رجحانات و ترجیحات سے سماجی اقدار میں تغیر و تبدیلی آتی ہے تو ایسے میں ایک گزرے ہوئے معاشرے کے اندر تہذیب، کلچر، رسم و رواج اور دیگر ایسے عوامل کو یاد کرنا فطری عمل ہوتا ہے. مشتاق احمد یوسفی اپنی نثر میں جہاں ماضی کی جھلک دکھاتے ہیں وہی پر ماضی میں ہونے والے واقعات کے محرکات، نفسیاتی و سماجی عناصر کا احساس اجاگر کرتے ہیں. انسان یادوں میں پناہ یا سہارا تب لیتا ہے جب وہ اپنے معروض میں کوئی ایسا منظر یا واقعہ دیکھتا ہے جس کا تعلق انسانی مشاہدے و تجربے سے ہوں تو ایسے میں انسان کو اپنا ماضی یاد آتا ہے. یوسفی سیاسی و سماجی ناہمواریوں کے محرکات کا ادراک رکھتے ہیں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں.

> "تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیے: ڈکٹیٹر خود نہیں آتا، لایا بلایا جاتا ہے اور جب آجاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے. باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بدو ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں۔ پر ایک نایاب بلکہ عنقا شے کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔" [۲۷]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیائی رجحان کے دونوں پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ ماضی کی یادوں کا بھوت سر پر سوار کر کے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں اپنے احساسات اور تجربات کو لکھتے جارہے ہیں بلکہ ماضی سے

شدید وابستگی اور اس کے اثرات سے متاثرہ کرداروں کی نفسیات دکھانے کی کوشش کرتے ہیں _ "ملاعاصی" کے کردار کے ذریعے یہ منظر دیکھا جاسکتا ہے:

"ملاعاصی سے اسی کمرے میں گھمسان کی ملاقاتیں رہیں جہاں پینتیس برس پہلے انھیں خداحافظ کہہ کر پاکستان آیا تھا۔ اسی زمانے میں سبھی پاکستان کھنچے چلے آرہے تھے۔ زمین جائداد، بھرے بتولے گھر، لگے گائے روزگار اور اپنے یاروں، پیاروں کو چھوڑ کر--- آج بھی انھیں اتنا ہی تعجب ہوتا ہے کہ بھلا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس کانپور کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ کمرے میں وہی پنکھا، اسی ڈگمگ ڈگمگ کڑے میں لٹکا، اسی طرح چرخ چوں کرتا رہتا ہے۔---ان کمرے میں گویا ایک عالم کی سیر ہوگئی۔ حجرہ جہاں نما کہیے۔ ہر چیز ویسی کی ویسی ہی ہے۔ بلکہ وہیں کی وہیں دھری ہے۔ بخدا مجھے تو ایسا لگا کہ مکڑی کے جالے بھی وہی ہیں جو چھوڑ کر آیا تھا۔ صرف ایک تبدیلی دیکھی۔ داڑھی پھر منڈوادی ہے۔ پوچھا تو گول کرگئے۔ کہنے لگے "داڑھی اس وقت تک قابل برداشت ہے جب تک کالی ہو۔"[۲۸]

ناسٹلجیا کو عموماً جذباتی آرزو، وابستگی یا رومان آمیز یادوں کا نام دیا جاتا ہے۔ اس گزرے ہوئے وقت یا تجربے کے لیے جسے کسی پُر مسرت اور مثبت جذبات سے جوڑا جاتا ہے۔ دوسری طرف اقداری ناسٹیلجیا سے مفہوم لیا جا سکتا ہے بعض اقدار یا نظریات کے ساتھ ایسی پرانی یادیں وابستہ ہونا جو ماضی میں نمایاں تھے۔ اقداری ناسٹیلجیا اکثر اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ عصری معاشرہ ان قدروں سے انحراف کر چکا ہے یا ان سے رابطہ کم کر چکا ہے۔ اس کا اظہار مختلف صورتوں یا طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے، جیسے کہ آسان اور آرام دہ گھڑی / وقت کی آرزو، روایتی ثقافتی اصول، یا برادری اور تعلق کا احساس جس کا موجودہ دور میں فقدان سمجھا جاتا ہے۔ اور بے قدری کی جاتی ہے۔ اقداری ناسٹیلجیا کا عام ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ لوگ ماضی کے مثبت پہلوؤں کو یاد کرتے ہیں اور اس کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ وقت گزرنے سے ماضی کے رجائی تاثرات چھوڑ کر، منفی تجربات کو فلٹر کرنے کا رجحان ہوتا ہے۔ مزید برآں، جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے، اس سے پہلے جو کچھ آیا اسے رومانوی اور مثالی بنانے کا فطری رجحان ہے۔

اقداری ناسٹیلجیا دو دھاری تلوار ہو سکتا ہے۔ ایک طرف، یہ افراد کو مشترکہ ورثے یا روایت سے جوڑ کر سکون اور شناخت کا احساس فراہم کر سکتا ہے۔ یہ کچھ اصولوں یا اقدار کی یاد دہانی کے طور پر بھی کام کر سکتا ہے جو لوگ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اہم ہیں اور انہیں برقرار رکھا جانا چاہئے۔ تاہم، ضرورت سے زیادہ اقداری ناسٹیلجیا ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے اور نئے خیالات اور نقطہ نظر کو اپنانے سے روک سکتا ہے۔ یہ تبدیلی کے خلاف مزاحمت پیدا کر سکتا ہے اور ابھرتی ہوئی سماجی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت کو محدود کر سکتا ہے۔

ماضی کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ اس کے منفی اثرات میں توازن برقرار رکھنا ضروری ہے۔ پرانی اقدار پر غور کرنے سے تاریخ اور ثقافت کے بارے میں ہم اپنے فہم کو وسعت دے سکتے ہیں، لیکن ان کا حال اور مستقبل کے تناظر میں تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایسا کرنے سے، ہم نئے خیالات کو اپناتے ہوئے اور ایک بہتر مستقبل کی تشکیل کرتے ہوئے ماضی سے سیکھ سکتے ہیں۔

ناسٹیلجیا ایک رومان آمیز یادوں کا مجموعہ اظہار ہے. اقداری ناسٹیلجیا عموماً اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ عصری معاشرہ ان قدروں سے انحراف کر چکا ہے یا ان سے رابطہ کھو چکا ہے۔ یہ مختلف طریقوں سے ظاہر ہو سکتا ہے، جیسے کہ آسان اور آرام دہ وقت کی آرزو، روایتی ثقافتی اصول، یا برادری اور تعلق کا احساس جس کا موجودہ دور میں فقدان سمجھا جاتا ہے۔ اقداری ناسٹیلجیا کا عام ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ لوگ ماضی کے مثبت پہلوؤں کو یاد کرتے ہیں اور اس کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ وقت گزرنے سے ماضی کے رجائی تاثرات چھوڑ کر، منفی تجربات کو فلٹر کرنے کا رجحان ہوتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے، اس سے پہلے جو کچھ آیا اسے رومانوی اور مثالی بنانے کا فطری رجحان ہے۔ اقداری ناسٹیلجیا دو دھاری تلوار ہو سکتا ہے۔ ایک طرف، یہ افراد کو مشترکہ ورثے یا روایت سے جوڑ کر سکون اور شناخت کا احساس فراہم کر سکتا ہے۔ یہ کچھ اصولوں یا اقدار کی یاد دہانی کے طور پر بھی کام کر سکتا ہے جو لوگ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اہم ہیں اور انہیں برقرار رکھنا چاہیے. تاہم ضرورت سے زیادہ اقداری ناسٹیلجیا ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے اور نئے خیالات اور نقطہ نظر کو اپنانے سے روک سکتا ہے۔ یہ تبدیلی کے خلاف مزاحمت پیدا کر سکتا ہے اور ابھرتی ہوئی سماجی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت کو محدود کر سکتا ہے۔

ماضی کے مثبت پہلوؤں کے استحکام اور ترقی کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے درمیان توازن قائم کرنا ضروری ہے۔ پرانی اقدار پر غور کرنے سے تاریخ اور ثقافت کے بارے میں ہم اپنے فہم کو وسعت دے سکتے ہیں، لیکن ان کا حال اور مستقبل کے تناظر میں تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایسا کرنے سے، ہم نئے خیالات کو اپناتے ہوئے اور ایک بہتر مستقبل کی تشکیل کرتے ہوئے ماضی سے سیکھ سکتے ہیں.

قیام پاکستان کے بعد نئے خطے میں قیام پذیر ہونے میں آنے والے لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا. وہ نئے وطن آنے کے بعد اپنی یادوں کی گٹھری ساتھ لائے تھے. اس گٹھری میں صرف ضرورت کا ساز و سامان نہیں بلکہ خوابوں سمیت آتے ہیں. جب وقت بدلتا ہے تو اقدار بدلتے ہیں، رویے بدلتے ہیں تو لوگوں کے مابین تعلقات کی نوعیت میں فرق پڑتا ہے. یہی وجہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کے اعصاب پر صرف ماضی کی یادوں کا غلبہ نہیں ہے بلکہ یہ ماضی کی طرف جاتے ہی تب ہیں جب بڑھتی ہوئی عمر، اکیلا پن کرادر پر حاوی ہو جائے. یہ نہیں کہ کردار شروع سے آسائشوں کی فرمائش کرتے دکھائی دیتے ہیں بلکہ ان کے ارد گرد سب کچھ موجود ہے اپنی زوجہ محترمہ کے

انتقال کے بعد یہ ماضی کے کانپور کو یاد کرتے ہیں. ماضی پرستی کے رویے کو دلائل سے بیان کرتے ہیں کہ ماضی جو کہ ایک تصور وخوبصورت تخیل کی بنیاد پر مبنی ہے جب حقیقت میں ماضی سے وابستہ جگہ، مقام یا لوگوں کو دیکھ لیا جائے تو "بشارت" کو ماضی یاد کرنے پر بھی افسوس کا اظہار کرتے دیکھا جا سکتا ہے. مشتاق احمد یوسفی ماضی اور حال کے مابین جو پردہ پوشی ہے اس کے اجزا کو بیان کرتے ہیں جب یہ پردہ اٹھتا ہے تب کی صورت حال کو بھی قاری پر عیاں کرتے ہیں. دلائل اس قدر خوبصورت ہیں کہ وہ انسان سوچتا ہے کہ ماضی اور حال کے مابین جو باریک پردہ ہے اس کے بیان میں کتنی لطافتوں کا بیان ہے. ماضی کے عظیم الشان یادوں کو مسترد تو نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور اس کی نوعیت میں بہتری کے پہلوؤں سے مباحث کا آغاز کرنا یہ یوسفی کا کمال ہے.

پروفیسر محمد حسن اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "آب گم" میں بڑی چالاکی اور چابک دستی سے ۱۹۴۷ کے "تہذیبی" المیے کے اس سارے الٹ پھیر کو پانچ مضامین اور پانچ کرداروں کے وسیلے سے نمٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس طرح کہ از اول تا آخر پڑھنے والے کے لبوں پر قہقہہ، آنکھوں میں آنسو اور دل میں دھڑکا رہے کہ یوسفی سیدھی راہ چلتے چلتے نہ جانے کس موڑ مڑ جائیں"[۲۹]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ماضی پرستی کا عنصر ان معنوں میں نہیں ہے کہ وہ ماضی پرست ہیں اور ماضی کی تکرار کو اپنی تحریروں میں پیش کر رہے ہیں. ماضی پرستی کی شدت سے تکرار کوئی صحت مند رویہ نہیں ہے. ماضی پرستی اگر ادیب کے لاشعور پر حاوی ہو جائے تو یہ ادیب کو ناسٹل جیک قرار دیا جاتا ہے. مشتاق احمد یوسفی مزاح نگار کے طور پر مشہور ہیں کتاب "اب گم" کے پیش لفظ میں کرداروں کے بارے میں لکھ دیا ہے کہ یہ ماضی پرست ہے تو ایسے میں لوگوں نے پوری کتاب کو ناسٹلجائی رجحان کی نمائندہ کتاب قرار دیا ہے. دیکھا جائے تو مشتاق احمد یوسفی اس اعتراف کو کتاب میں کرداروں کے ذریعے کھولتے نظر آتے ہیں کہ کس طرح ماضی پرستی کا رجحان کسی کردار یا واقعے سے متاثر ہوتا ہے اس واقعے کے دوران بعد از واقعہ کے تاثرات کا اظہار کیسے ہوتا ہے. یہاں یوسفی اپنی نثر میں ناسٹلجایا کیا ہے؟ ادب میں اس کے استعمال سے کوئی صحت مند رجحان یا رویہ فروغ پا سکتے ہیں؟ ناسٹلجائی رجحان کے رویوں کو زیر بحث لاتے ہیں کہ ماضی کی یادوں کے ساتھ ایک رومانس معاشرے کے لئے کس قدر سود مند ہے. ماضی سے وابستہ کرداروں کا رویہ اقداری روایات کو کیسے متاثر کرتا ہے یہ مباحث یوسفی اپنے کرداروں کے ذریعے کراتے ہیں.. ناسٹلجیا یا انفرادی نوعیت کا ہو سکتا اور اجتماعی صورت بھی ممکن ہے. اس حوالے سے ڈاکٹر مظہر احمد لکھتے ہیں : .

> "آب گم کا ناسٹل جیا دراصل مشتاق احمد یوسفی کا ناسٹل جیا نہیں ہے، ان پاکستانیوں کا بھی ناسٹل جیا ہے، جو تقسیم ملک کے بعد ہجرت کرکے اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان گئے تھے اور جس کے تادم تحریر انہیں گلے سے نہیں لگایا اور ہمیشہ مہاجر کی تہمت ان پر لگی رہی. ان پاکستانیوں میں وہ

حلقہ جو ادیب و شاعر کہلاتا ہے اس ناسٹل جیائی کیفیت کا نسبتاً زیادہ شکار رہا. انہیں اپنے وطن، اپنے بچپن، جوانی اور زندگی کے ایک بڑے حصے کی یاد ستاتی رہی جس کا اظہار انہوں نے اپنے ادب میں کیا ہے. یہی وجہ ہے کہ کہ اکثر پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات میں ماضی پرستی کی ایک مسلسل لے ملتی ہے. مشتاق احمد یوسفی جن کا اصل وطن راجستھان ہے اس سے کس طرح بچ سکتے تھے. مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ ناسٹل جیا کی خامیوں کے ساتھ ساتھ اس کی برکتوں کا بھی اظہار کر جاتے ہیں. "آب گم" میں کچھ کردار ماضی پرست ہونے کے باوجود زندہ و متحرک ہیں، جبکہ کچھ کردار کے ناسٹل جیا سے دردمندی و محرومی کی کیفیت عیاں ہوتی ہے" ۳۳

ناسٹلجیا کا اثر انسانی رویوں پر براہ راست پڑتا ہے یہ انسان کو تنہائیوں میں لے کر جاتی ہے بھیڑ میں انسان خود کو تنہا اور مس فٹ محسوس کرتا ہے. ناسٹلجیا کا اثرات کا غلبہ تب حاوی ہوتا ہے کہ جب انسان کو حال توقعات کے برعکس دکھائی دینے لگے ایسے میں انسان ماضی کی اقدار کو یاد کرتا ہے. ماضی سے وابستہ یادوں میں ناسٹیلجیا میں درج ذیل عناصر نمایاں کردار ادا کرتے ہیں. پرانے اوزار اور مصنوعات، موسیقی، راگ، رشتے اور تعلقات، رسوم و رواج، روایات، تاریخی مقامات زبان اور محاورہ، موسم، خوراک اور پکوان، ملبوسات اور رجحانات اور خوشبو نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔" قبلہ "، "تلمیذ الرحمن، " "بشارت "، "صبغے اینڈ سنز" جیسے کرداروں میں یہ عناصر نمایاں طور دیکھے جا سکتے ہیں۔

دوسرے ملک جا کر بسنے والے لوگ اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہوئے احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں، وہ اپنے لباس، زبان، خوارک حتیٰ کہ تہذیبی اقدار کو بدلنے پر مجبور ہوتے ہیں اکثریت کے ساتھ چلنا، پھر نا مجبوری بن جاتی ہے۔ یہ تبدیلیاں کرتے ہوئے لاشعوری طور پر انسان کے خیالات میں وہ ماضی کی یادیں وابستہ رہتی ہیں۔ انسان حال کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش بے سود رہتی ہے۔ کچھ چیزیں بدلنے کے باوجود نہیں بدلتی شاید یہ ان کے بس میں نہیں ہوتا، جیسے چہرے، رنگت کے خدوخال، لہجہ وغیرہ۔ شہریت مل بھی جائے تو ایک عجیب اقلیت یا دوسرے یا تیسرے درجے کی شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ اس کی ساجی مثالیں، قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرنے والوں کی صورت میں مہاجرین، اور افغان جنگ کے بعد افغانی وغیرہ کے القابات کی صورت میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

یوسفی نے اس تجربے سے حامل دونوں رویوں کو کرداروں کے ذریعے دکھایا ہے. زرگزشت میں ہجرت کے تجربے کو غالباً شعر ادب میں ایک منفرد زاویے سے دکھایا ہے کہ ہجرت کرنے کے بعد پاکستان کی مٹی کو چھوتے ہیں جو کہ ایک خوشگوار تجربے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جب کہ دوسری جانب " آب گم " میں قبلہ " کردار کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد آنے والے لوگوں نے کس کرب کو جھیلا. ہجرت کے بعد وہ آسائشیں نہیں ملتی ہیں جو کہ

دیانت داری سے یہ یہاں لاتے ہیں. اس کردار کا ناسٹلجیا انفرادی سے زیادہ اجتماعی صورت اختیار کرتا ہے. دونوں رویوں کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ زر گزشت میں لکھتے ہیں:

"وہ صبح نہیں بھولے گی جب ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل "پاکستان" لکھا نظر آیا تو اسے ہاتھ سے چھُو چھُو کر دیکھا تھا. پھر مٹی اٹھا کر دیکھی. اسلام علیکم کہتے ہوئے سندھی ساربان دیکھے. ہندوستان کے نوٹ پر پہلی دفعہ حکومت پاکستان چھپا ہوا دیکھا. اور پھر ریگزار راجستھان میں پرکھوں کی قبریں، وہ بولی جو ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے، خیر گی امروز میں دھندلاتے چلے گئے۔"[۳۱]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ہجرت کا یہ پہلو خوشگوار تجربے کی عکاسی کرتا ہے. یہ وہ رویہ ہے جو کہ ایک تہذیبی اقدار کو زندہ جاوید بناتا ہے. اس سے قبل ہجرت کے واقعات کا ذکر اکثر لوٹ مار، غیر انسانی رویوں کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ ہجرت کے وقت انسان مرتے ہیں ایک دوسرے پر ظلم ہوتا ہے، سکھ، ہندو، مسلمان یہاں تک کہ نسل و رنگ کے اختلاف کے بغیر انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے.

مہاجرین ہجرت کے بعد جو دکھ، درد سے لاچار ہوتے ہیں ایک اذیت سے گزرتے ہوئے اپنی اور اجتماعی اقدار کی پامالی پر افسردہ دکھائی دیتے ہیں. ہجرت کے بعد اپنی گٹھری میں جائیداد کے کاغذات اور ان جھونپڑیوں، کوٹھیوں کی بلیک اینڈ تصاویر وزٹینگ کارڈ کی طرح چلتے پھرتے دکھائے ہیں. کہاں جاتا ہے کہ یوسفی کے یہ کرادر ناسٹلجائی رجحان کے عکاس ہیں دراصل یہ المیہ اکثریت کا ہیں جو کہ ہجرت کرکے یہاں آئیں ہیں. "آب گم" کے کرادر قبلہ کے زبانی دکھایا گیا ہے. کہ کس طرح دکھ درد کے ساتھ یہ خالق حقیقی سے جاملتا ہے. اس کے متعلق یوں لکھا ہے کہ انسان اس نا قابل تلافی نقصان کا ازالہ قیامت کے دن بھی محسوس کرے گا. ان خیالات کا بیان "آب گم" میں یوں ہوتا ہے.

"اکثر خیال آتا ہے، اگر فرشتے انھیں جنت کی طرف لے گیے جہاں موتیا دھوپ ہوگی اور کاسنی بادل، تو وہ باب بہشت پر کچھ سوچ کر ٹھٹک کر جائیں گے. رضوان جلد اندر داخل ہونے کا اشارہ کرے گا تو وہ سینہ تانے اُس کے قریب جا کچھ دکھاتے ہوئے کہیں گے:

"یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔"[۳۲]

ہجرت کے تجربات کو مزاح کے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے یوسفی اکثریت کے دکھوں کی نوعیت کو بیان کرتے ہیں. یہ ہجرتیں انسان کی روح کو متاثر کرتی ہے. اس حوالے سے کرادر صرف آسائشوں سے محروم دکھائی نہیں دیتے ہیں بلکہ ہجرت کے بعد خودی اور انا کی قربانی دینی پڑتی ہے. یوں اس کرب کو قبلہ کی صورت میں دکھایا گیا ہے. اس حوالے سے سید مظہر جمیل لکھتے ہیں:

"بے شک وہ عذاب جن سے مرزائے موصوف جیسے لاکھوں افراد اس عہد میں گزر رہے تھے، گلا دینے والا عذاب ہی تھا. یہ صرف زندگی کی آسائشوں سے محرومی کا عذاب نہیں تھا بلکہ قدم قدم پر خودداری کو اپنے ہی ہاتھوں ذبح کرنے، ضمیر کو نیلام چڑھانے اور پل پل منافقت کے دکھ جھیلنے کا عذاب تھا. جن سے تارکین وطن کی اکثریت اس تازہ وطن کی فضاؤں میں دوچار تھی۔۔۔"[۳۳]

ماضی کی بنیاد یادوں پر مبنی ہے انسان کا ماضی سے تعلق فطری ہے۔ ناسٹلجیا انسان کے اجتماعی اقدار کا عکاس ہوتا ہے. ماضی پر نظر ڈالی جائے تو ایک اخوت، اتفاق، برداشت اور دوسرے کا احترام دیکھنے کو ملتا ہے. انسانی رشتوں میں خلوص اور محبت کی کی روایت موجود ہے. جب وقت بدلتا ہے، حالات بدلتے ہیں تو انسانی رویے بھی بدلتے ہیں. رویوں کے بدلنے سے قدیم اور جدید کا آغاز ہوتا ہے. جدید نسل کے رجحانات، میلانات کا بزرگوں کے رجحانات و میلانات کے ساتھ فکری مباحثہ شروع ہوتا ہے. انسانی رویوں میں عدم توازن ماضی اور حال کے مابین تعلقات کی نوعیت پر سوالیہ نشان لگاتا ہے. مشتاق احمد یوسفی اپنی نثر میں ماضی کے حامل کرداروں کی نفسیات اور عصری رجحانات کے حامل کرداروں کے ذریعے دونوں پہلوؤں کو دکھاتے ہیں. یہ بھی عیاں کرتے ہیں کہ ماضی بیکار نہیں ہوتا، یہ درست ہے کہ ماضی واپس نہیں آسکتا، ماضی میں جانا ناممکن ہے، لیکن ماضی کو کی اہمیت سے انکار کرنا بھی کوئی صحت مند رویہ نہیں. اعتدال پسندی ہی ماضی اور حال کے معاملے کو متوازن زاویے سے پیش کر سکتی ہے. دنیا بھر میں لکھا جانے والا ادب کسی نہ کسی صورت میں ماضی کے واقعات کی عکاسی کرتا ہے. قومیں شاندار ماضی کو یاد کرکے عبرت حاصل کرتی ہیں، تاریخ میں ہونے والی غلطیوں سے سبق سیکھ کر آگے بڑھنے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں. بے اعتدالی کا پہلو غالب ہونے پر جو امکانات پیدا ہوتے ہیں وہ مشتاق احمد یوسفی اپنی تحریر میں واضح کرتے ہیں کہ انفرادی طور پر اگر کسی شخص پر ماضی کا بھوت سوار ہو جائے تو "چراغ تلے" کا تلمیذ الرحمن کی صورت اختیار ہوتی ہے کہ کسی سے کوئی بات نہیں کرنی، عصری رجحانات کے حامل افراد کو رد کرنا، اپنے ماضی کے واقعات میں حد سے زیادہ ملوث ہو کر دوسروں کو زبردستی اس میں شامل کرنا. اس طرح کا ایک کردار "خاکم بدہن" کا "صبغے اینڈ سنز" بھی ہے جو جدید شعراء کی نفی کرتا ہے، ادب کو غالب کے کلام تک محدود کیا ہے، اس طرح شخصی ماضی پرستی انفعال کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے. اس کے ساتھ یوسفی "آب گم" میں قوموں کی حد سے زیادہ ماضی سے وابستگی کو ایشیائی قوموں کا ولن بتاتا ہے. اس پہلو سے دیکھا جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ اجتماعی طور پر ماضی قوموں کے زوال میں کتنا اہم کردار ادا کرتی ہے. یہ حقیقت ہے کہ یوسفی اپنی نثر میں کرداروں کے رویوں پر ناسٹلجیا کے منفی اثرات کا تجزیہ پیش کرتے ہیں. اب گم میں لکھتے ہیں۔

" کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو کو مسلط کر لیتی ہیں - غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے - جو قوم جتنی پسماندہ درماندہ اور پست حوصلہ ہو، اس کو اپنا ماضی، معکوس، اقلیدسی تناسب (inverse geometrical ratio) میں اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے. ہر آزمائش اور ادبار اور ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے - اور ماضی بھی وہ نہیں جو واقعتاً تھا، بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سر نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے - ___ ماضی تمنائی"

مشتاق احمد یوسفی کی نثر کی کئی جہتیں ہیں جن میں طنز و مزاح، سماجی اقدار کی زوال پذیری، المیہ، قومی سیاسی شعور، نفسیاتی و معاشی اور اور ناسٹلجیا جیسے موضوعات قابل ذکر ہیں. موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے. سیاسی و سماجی ناہمواریوں کے ساتھ نفسیاتی عناصر کو اپنی تحریر کا موضوع بناتے ہیں. اپنی نثر میں ناسٹلجائی رجحان کے تحت فکری مباحث کو زیر بحث لاتے ہیں. ناسٹلجائی رجحان کو ایک منفرد زوایے سے بروئے کار لاتے ہیں.؛ ناسٹلجائی رجحان کے تحت لکھے گئے فن پاروں میں ماضی پرستی کا بھوت حاوی محسوس ہوتا ہے اس وجہ سے ان مصنفین کو ناسٹل جیک لکھاری بھی کہا گیا، لیکن یوسفی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ناسٹلجیا کی تکینک کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں. اپنے اوپر ناسٹل جیک کا لیبل لگانے سے بچانے میں کامیاب ہوتے ہیں گو کہ ناقدین یوسفی کو ناسٹل جیک ثابت کرنے کے لیے یوسفی کے "آب گم" سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جو کہ ناکافی ہے. دیگر فکری و سماجی موضوعات کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں. یوسفی نے ناسٹلجیا کے مثبت اور منفی پہلوؤں میں توازن کو برقرار رکھا ہے. عدم توازن پر اس رجحان کے منفی پہلو کو سامنے رکھا ہے. اس لئے ناسٹل جیک کے لیبل سے بچ گیے ہیں. اس باب میں مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر و اقداری ناسٹلجیا: تعین و تلاش کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ناقدین کی آراء اور مشتاق احمد یوسفی کی نثر سے اقتباسات کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اگلے باب میں " مشتاق احمد کے رویوں میں ناسٹلجائی عناصر : شخصی و نفسیاتی تجزیہ " پیش کیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ زر گزشت (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۸ء) ص ۴۹۔

۲۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ آب گم (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن) فلیپ۔

۳۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ چراغ تلے (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء) ص ۴۹۔

۴۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ آب گم (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن) ص ۴۳۔۴۴۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۱۶۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۷۔۱۸۔

۷۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ چراغ تلے (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء) ص ۵۴۔۵۵۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۵۔۵۶۔

۹۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ زر گزشت (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۸ء) ص ۶۹۔۷۰۔

۱۰۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر۔ رفتہ و آئندہ (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء) ص ۲۲۱۔

۱۱۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ شام شعر یاراں (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن) ص ۱۶۱۔

۱۲۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ آب گم (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن) ص ۲۱۳۔۲۱۴۔

۱۳۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ زر گزشت (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۸ء) ص ۱۵۷۔۱۵۸۔

۱۴۔ عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر۔ یوسفی کا مزاح اور ان المیہ شعور (مشمولہ معیار شمارہ ۲۰، مدیر عزیز ابن الحسن۔ اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی ۲۰۱۸ء) ص ۲۳۵۔

۱۵۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ چراغ تلے (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء) ص ۶۳۔۶۴۔

۱۶۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ آب گم (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن) ص ۷۵۔

۱۷۔ ایضاً،ص۶۷۔

۱۸۔ یوسفی،مشتاق احمد۔چراغ تلے(کراچی:مکتبہ دانیال،۱۹۹۴ء)ص۵۵۔

۱۹۔ یوسفی،مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس،س۔ن)ص۴۳۔

۲۰۔ یوسفی،مشتاق احمد۔چراغ تلے(کراچی:مکتبہ دانیال،۱۹۹۴ء)ص۲۶۔

۲۱۔ یوسفی،مشتاق احمد۔زرگزشت(کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۸ء)ص۲۵۔

۲۲۔ ایضاً،ص۱۳۴۔

۲۳۔ یوسفی،مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس،س۔ن)ص۱۱۰۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ مظہر جمیل،سید۔آشوب سندھ اور اردو فکشن(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۰۲ء)ص۱۴۵۔

۲۶۔ یوسفی،مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس،س۔ن)ص۱۸۔

۲۷۔ ایضاً،ص۱۳۔

۲۸۔ ایضاً،ص۲۵۹۔۲۶۰۔

۲۹۔ محمد حسن،پروفیسر۔ست رنگے لمحوں کا تاجدار:مشتاق احمدیوسفی(مشمولہ مشتاق احمد یوسفی:چراغ تلے سے آب گم تک،مرتبہ طارق حبیب۔لاہور:شرکت پرنٹنگ پریس،۱۹۹۷ء)ص ۲۴۶۔

۳۰۔ یوسفی،مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس،س۔ن)ص۲۹۲۔۲۹۳۔

۳۱۔ یوسفی،مشتاق احمد۔زرگزشت(کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۸ء)ص۲۵۔

۳۲۔ یوسفی،مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس،س۔ن)ص۴۳۔

۳۳۔ مظہر جمیل، سید۔آشوب سندھ اور اردو فکشن(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۰۲ء)ص۱۴۷۔

۳۴۔ یوسفی، مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس، س۔ن)ص۱۸۔

باب سوم:

مشتاق احمد یوسفی کے رویوں میں ناسٹلجیائی عناصر: شخصی و نفسیاتی تجزیہ

باب سوم

مشتاق احمد یوسفی کے رویوں میں ناسٹلجیائی عناصر: شخصی و نفسیاتی تجزیہ

رویہ کسی بھی انسان کی شخصیت کا تعارف ہوتا ہے۔ رویہ دو پہلوؤں پر مبنی ہوتا ہے۔ مثبت رویہ اور منفی رویہ۔ رویئے کا براہ راست تعلق انسانی سوچ سے ہوتا ہے۔ انسانی سوچ و فکر کے زاویہ انداز سے ہوتا ہے۔ کسی شخصیت کے رویے میں ٹھہراو، برداشت اور رواداری ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ رویے میں توازن ہی ایک شخصیت کا تعین کرتی ہے کہ انسان کا مثبت اور توانا طرز فکر دنیا کے سامنے ایک بہترین رویے کی کلید ہے۔

زیادہ تر دیکھا گیا ہے کہ رویے کا انحصار انسان کے طرز فکر، نقطہ نظر اور کسی حد تک عقائد پر ہوتا ہے۔ انسان کا رویہ ہی زندگی میں اس کو مختلف مسائل سے نمٹنے کے قابل بناتا ہے اور اپنے متعلقہ منزل کے حصول کے لئے متحرک رکھتا ہے۔ انسانی رویے کی مختلف شاخیں ہیں جیسا کہ سنجیدہ رویہ، جذباتی رویہ، اخلاقی رویہ اور سماجی رویہ۔ شعبہ نفسیات میں انسانی رویوں کی طویل بحث موجود ہے جو کہ انسانی شخصیت کے پرکھنے اور انسانی معاشرے کی ترقی و نشو نما میں زیر بحث آتے ہیں۔ رویے تعلیم و تربیت اور مشاہدات و تجربات سے فروغ پاتے ہیں اور علم کے ذریعے رویوں میں لچک پیدا ہوتی ہے۔ رویے بدلتے ہیں تو صرف انداز فکر، سوچ، ذہنی ہم آہنگی اور دوسروں کے ساتھ مکالمے سے۔ انسانی زندگی اور انسانی معاشرے میں ٹھہراو، رواداری اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی رویوں کی لچک ہی انسان کے لئے اہم ہے۔ حالات کے بدلنے سے گھبرانا نہیں چاہیے وقت بدلنے کے لیے ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے ہیں۔ اگر رویے بدلنا شروع ہو جائیں تو انسانی زندگی اور معاشرے میں توازن برقرار رکھنا قدرے مشکل ہو سکتا ہے۔ بدلتے رویے وقت اور حالات کے متضاد رویوں کی ترجمانی اختیار کرتے ہیں۔ رویے کی تبدیلی سے ٹکراو کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ نئے رویے عصبیت کی بنیاد اختیار کرتے ہیں تو یہ انسان اور انسانی معاشرے کی ارتقاء و نشو نما میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ جدید نسل کے رجحانات اور ایجادات سے آنکھیں بند کرنا دانش مندی نہیں لیکن جدید نسل کا رویوں میں شدت والا عنصر باقی تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتا ہے۔ ایک نسل کے رویوں میں شدت، تعلیم و تربیت، مشاہدات و تجربات، مکالمہ، رواداری اور عدم برداشت کے سبب فروغ پاتے ہیں۔ رویوں میں توازن کے لئے احساس کی نرمی، دلوں کی وسعت اور انسانی کردار میں عاجزی اہم عناصر ثابت ہوتے ہیں۔ نئی تہذیب اور نئے کلچر کے امکانات اپنی جگہ لیکن یوں دوسروں کی آرا، تجربات اور مشاہدات سے آنکھیں بند کر کے اپنی میں میں رہنا انسانی زندگی میں مسائل کے اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ اختلاف رائے کو نفرت میں بدلنا، برداشت کو برخاست

کرنا، مکالمے کی فضا کو اجازت نہ دینا انسانی رویوں میں عدم توازن کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ انسانی رویوں کی شاخوں میں ایک شاخ انسان کی اخلاق اقدار کے متعلق ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ اخلاقی رویوں کا تعلق مختلف محرکات اور عوامل کے بارے میں ہمارے رد عمل سے ہے ۔اس حوالے سے بنیادی بات یہ ہے کہ ان رویوں کے اظہار کے رد عمل میں احتیاط برتنا ضروری ہے۔ سماجی برتاو کے رویوں کو سمجھنے کے لئے ان کو مختلف اجزا میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔جو کہ مثبت سماجی رویے، منفی سماجی رویے، غیر جانبدار سماجی رویے اور بدترین تخریبی سماجی رویے۔ انسانی رویوں کے حوالے سے عمومی طور پر یہ تاثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ انسانی رویے سیاسی، سماجی و معاشرتی، مذہبی، قومی و بین الاقوامی اور موسمی و جغرافیائی عوامل کے زیر اثر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ قوموں کی ترقی و نشو نما کا انحصار ان عوامل پر ممکن ہے لیکن اس تمام میں انسان کے رویے میں توازن، ہم آہنگی اور برداشت قابل ذکر ہیں ۔انسانی رویے معاشرے میں آکسیجن کی مانند ہوتے ہیں ۔انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ انسان ایک دوسرے سے مکالمہ کرتا ہے۔ ضروریات زندگی کے لئے انسان کا دوسرے انسان سے مکالمہ انسانی سلوک کا حامل ہونا چاہیے۔ رویوں میں اتار چڑھاو انسان کی انفرادی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ انسان معاشرے میں اکائی کی صورت اختیار کرتا ہے ۔اس طرح انسانی رویوں میں توازن برقرار رکھنا ہی حقیقی معنوں میں انسانی معاشرے کی ترقی کا ضامن ہے۔ معاشرے کی اصل پہچان اس کے افراد کے اجتماعی رویے ہی ہوتے ہیں۔ قوموں کی ترقی و تنزلی کا انحصار ہی انسانی رویوں پر ہوتا ہے۔ یہ رویے بزرگوں، بچوں، اساتذہ، طلبہ، خاندان الغرض تمام طرز معاشرت ایک فرد اور ایک قوم کی سوچ، انداز فکر اور شعوری سطح کی عکاسی کرتے ہیں۔

معاشرے میں معاصر رجحانات اور تحریکوں کا ادیب پر اثر انداز ہونا فطری عمل ہے ۔ادیب جس فضا میں سانس لیتا ہے اسی فضا میں موجود سماجی گھٹن اور سماجی تبدیلیوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتا ہے معاصر فکری تحریکات اور رجحانات کی عکاسی ادیب کی تخلیقات میں ہوتی ہے۔

دور حاضر میں ناسٹل جیا ایک اہم ادبی رجحان کے طور پر سامنے آیا ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں ناسٹلجیائی عناصر کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عالمی سطح پر گذشتہ صدی میں ایسے کئی واقعات رونما ہوئے ہیں جو کہ انسان کو یہ سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں کہ اس کا ماضی اس کے حال سے بہتر تھا ۔بیسویں صدی کی دو عظیم جنگیں ،ورلڈ ٹریڈ سنٹر (نائن الیون) کی تباہی ،مابعد نائن الیون کے حالات اور ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے تباہ کن نتائج سامنے آئے۔ یوں بین الاقوامی اور قومی سطح پر انتشار اور بے گانگی کا منظر نامہ دیکھنے کو ملتا ہے ۔ان حالات وواقعات نے ناسٹل جیا کے رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ عالمی ادب میں بھی ناسٹلجیائی رجحان فروغ پایا۔

اردو ادب میں ناسٹلجیا کے ابتدائی اثرات میر، درد اور غالب کے کلام میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بیسوی صدی کے سیاسی وسماجی حالات وواقعات کا اردو ادب پر براہ راست اثر پڑا۔ ان سماجی واقعات اور تبدیلیوں سے لوگوں کے رویوں، سوچ اور اجتماعی نفسیات کو متاثر کیا۔ بیسویں صدی میں جلیانوالہ باغ واقعہ، تقسیم (۱۹۴۷)، ۱۹۶۵ جنگ، سقوط ڈھاکہ، سقوط سویت یونین اور نائن الیون جیسے قابل ذکر اجتماعی واقعات ہیں۔ ان واقعات سے انسانی سوچ، فکر اور نفسیاتی حوالے سے اکیسویں صدی کے انسان کے اعصاب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان ماضی میں سکون اور اطمینان محسوس کرنے لگتا ہے جو کہ ان اجتماعی حالات وواقعات سے قبل ان کو حاصل تھا۔ ادب انسانی تجربات، مشاہدات اور احساسات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ادب میں ناسٹلجیا غالب رجحان کے طور پر ابھرتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے ادب میں ناسٹلجیائی رجحان نمایاں صورت کے طور پر سامنے آیا۔ ماضی کی حسین کے ساتھ تلخ تجربات اور یادوں کو تخلیق کاروں نے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ایک بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کرکے پاکستان آتے ہیں۔ ملک چھوڑتے ہی انسان اپنے تجربات واحساسات تو نہیں چھوڑتا۔ یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ملک چھوڑنے سے ماحول تو بدل جاتا ہے لیکن دل ودماغ بدلنے میں وقت لگتا ہے۔ یادیں انسان کو تروتازہ رکھتی ہے کبھی تو یادیں دیمک کی طرح انسان کو اندر سے کھوکھلا کرتی ہے تو کبھی یادیں انسان کو سوچنے سمجھنے اور حالات کا سامنا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لئے اس حقیقت کو قبول کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمارے اردگرد کی صورت حال اس سے بہت مختلف تھی جو کہ آج ہمارے سامنے ہے۔ ماضی ہماری یادوں میں زندہ رہتا ہے کبھی خوشگوار تو کبھی دل کو بوجھل کرنے والا۔ لیکن دنیا تو ترقی کررہی ہے اور آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ چلنا تو ہے خواہ اس کا تعلق معاشرے کی اخلاقی اقدار سے ہو، رہن سہن، سیاسی وثقافتی معیار اور جغرافیائی صورت حال سے، سوچ، انداز فکر، میل جول الغرض ہر چیز اور ہر جگہ تبدیلی کا عمل جاری ہے یہ ارتقاء کی ایک صورت ہے۔ ایسے میں انسان ماضی کی یادوں میں توازن برقرار رکھتا ہے تو ایک صحت مند ماحول، صحت معاشرہ اور صحت فن پارہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ ناسٹل جیا ایک رجحان کی صورت اختیار کرتا ہے تو دیکھا جاسکتا ہے کہ ماضی کی بازیافت، ماضی کی کسک فن پاروں میں شدت سے شامل ہوتی ہے جو کہ ناسٹل جیا کے رجحان کا ایک منفی پہلو ہے۔ انسانی جذبات واحساسات میں توازن بگڑتا ہے تو حال اور مستقبل پر ماضی کی گرفت مضبوط ہوکر سامنے آتی ہے۔ جدید نسل حال کے تقاضوں، رجحانات اور چیلنجز سے فرار اختیار کرکے ماضی کا سہارا لیتا ہے۔ یہ رویہ انسانی سماج کے لئے تشویش کا سبب بنتا ہے۔

ناسٹلجیا کا لفظ دو یونانی الفاظ " nostos " واپسی "algos" درد کے باہمی اشتراک سے بنا ہے۔ لفظ ناسٹل جیا کو باقاعدہ اصطلاح کے طور پر "جوہانسس ہوفر" نے استعمال کیا۔ ملک واپسی، گھر بار کی یاد، اور کسی محاذ جنگ میں فوجیوں

کی کیفیات اور محسوسات کے لئے یہ اصطلاح استعمال کی گئی۔ ابتدا میں علم نفسیات اس اصطلاح کا استعمال ذہنی امراض میں مبتلا مریضوں کے لئے ہوتا تھا۔ یہ ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ انسان حال اور مستقبل کی پرواہ کئے بغیر ماضی میں پناہ لے لیتا ہے۔ ناسٹل جیا گزرے وقت کی تاریخ ہے۔ ناسٹل جیا حال اور ماضی کے مابین یک طرفہ مکالمہ ہے۔ جس میں ماضی حال پر حاوی ہو کر حال کو ماضی کے حالات واقعات پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ممکنات میں سے ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے بچپن اور جوانی کے معاشرتی اور جغفرائی ماحول سے وجودی طور پر دور رکھا جائے تو ان حالات واقعات سے جو خلا جنم لیتی ہے وہ ناسٹلجیائی کیفیت کی ترجمان ہوگی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اس اصطلاح کا استعمال ایک نفسیاتی بیماری کے طور پر ہوا۔ اس کا پس منظر سوئس فوجیوں کی وطن واپسی کی خواہش، گھر بار کی یاد کا تناظر بتایا گیا ہے۔ پردیس میں فطری طور پر انسان کو اپنا وہ علاقہ اور گھر یاد آتا ہے تو طبیعت اور مزاج میں ایک بوجھل سی تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔ اس طرح ناسٹل جیا کو ابتدا میں ایک بیماری کے طور پر استعمال کیا گیا شدت سے اپنے وطن اور گھر کے یاد کے زمرے میں۔ کیمبرج انگلش ڈکشنری میں ناسٹل جیا یوں بیان ہوتا ہے۔

"A feeling of pleasure and also a slight sadness when you think about things that happened in the past."[1]

وہ احساس جس میں خوشی اور اداسی کی آمیزش ہو جب ماضی کے حالات واقعات کو یاد کر کے حال کی سختی یا تلخی ماضی کو یاد کرنے سے کم محسوس ہوتی ہے۔ بعض لوگ اس کیفیت یا لمحات کو قدرے زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ آن لائن انگریزی سے اردو میں ناسٹلجیا کے متعلق یہ بیان ہوتا ہے "ماضی کی حسرت ناک یادیں، ماضی کی یاد دلانے والی شے یا اشیاء گھر کی یاد"[2]

پریکٹیکل ڈکشنری میں ناسٹل جیا کے متعلق بیان ہوتا ہے

"nostalgia describes a longing for the past often in idealized from nostalgia may or may not also be known as a home sickness"

Www.nostalgia.com

جوہانسس ہوفر نے ناسٹل جیا کی اصطلاح جب استعمال کی تو اس کے متعلق جوزف بنکس نے کہا

"By 1850s nostalgia was losing it's as a particular disease and coming to be seen rather in first and 2nd world war still being recognized"

ڈاکٹر قاضی جاوید ناسٹل جیا کے موضوع کے متعلق لکھتے ہیں کہ

" بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹل جیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے- وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورت حال کی ناخوشگواری کا مداوا کر سکتے ہیں "[۷]

ناسٹل جیا کے تین اقسام جو جادہ تر زیر بحث آتے ہیں-

۱ وطن واپسی کی خواہش

۲ نفسیاتی بیماری

۳ یاد ماضی

وطن واپسی کی خواہش کا اظہار "ہوفر" نے سوئس فوجیوں کے حوالے سے کیا ہے کہ دوسرے ملک میں مسافر شخص کو اپنے وطن کی یاد آتی ہے۔ اس کیفیت کو ناسٹلجیا کی ابتدائی صورت کہا جاتا ہے۔

انسانی رویوں، جذبات واحساسات میں جب توازن بگڑتا ہے تو ماضی کی یادیں انسان کو نارمل نہیں رہنے دیتی۔ حال اور مستقبل سے زیادہ ماضی کے جھروکوں میں رہنا ایک قسم کی ماضی پرستی ہے جو کہ انسانی سماج میں ایک مسلے کا سبب بنتی ہے۔

یاد ماضی: وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے کچھ لوگوں کے لیے اس حقیقت کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ماضی ہماری یادوں میں زندہ رہتا ہے کبھی خوشگوار اور کبھی دل کو بوجھل کرنے والا لیکن دنیا ترقی کر رہی ہے۔ اس کی روایات اور اخلاقیات بدل رہی ہے۔ لیکن ایسے میں ماضی کے ساتھ چمٹ کر رہنا، یادوں کے سہارے زیست کرنا جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ قوموں کی اجتماعی تاریخ میں ماضی ایک اہم پہلو ہے جس سے قومیں آگے بڑھتی ہے دیگر اقوام کے ساتھ مقابلے کے امتحان میں ایک قوم بن کر سامنے آتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

" قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ میں اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔"[۸]

ناسٹلجیا کی کیفیت کو فروغ دینے میں ہجرت اور تلاش معاش ملک، شہر اور دیہات سے دوری بھی ہے۔ یہ گو کہ خود اختیار کردہ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اپنوں سے دوری کے سبب اپنے گھر اور اپنوں کی یاد انسان کو ناسٹلجیائی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ نائن الیون واقعے کے بعد پاکستانیوں کو کس قدر معاشی سیاسی اور نفسیاتی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں ملک بھر میں خصوصا خیبر پختونخواکے علاقوں میں لوگوں کو نقل مکانی اور ہجرت کرنی پڑی۔ نائن الیون سے پیدا ہونے والے حالات نے مقامی لوگوں کے نفسیاتی و سماجی مسائل میں اضافہ کرتے ہوئے ان کے نفسیاتی اور ناسٹلجیائی کیفیت میں اضافہ کیا- سوات آپریشن ۲۰۰۹ کے وقت راقم نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ چار سے پانچ ماہ کے لیے ملاکنڈ ڈویژن سے مردان، صوابی اور اسلام آباد ہجرت کرنی پڑتی ہے۔ اس

دوران اپنے علاقے، گھر اور ماحول کی یاد نے لوگوں کو ناسٹلجیائی کیفیت میں مبتلا رکھا- ناسٹلجیائی کیفیت اور ناسٹلجیائی رجحان کو فروغ دینے میں ہجرت، گھر کی یاد اور اس کے ساتھ ساتھ نئے علاقے میں سہولیات زندگی سے محرومی بھی ناسٹلجیائی کیفیت میں مبتلا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

ناسٹلجیائی رجحان کو فروغ دینے میں کسی بڑی تہذیب کی زوال آمادگی یا کسی آدرش نظریے کی شکست وریخت بھی ایک محرک بنتا ہے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں جیسا کہ ۱۹۴۷ تقسیم ہند، سقوط بنگال، سوویت یونین کے زوال اور نائن الیون کے بعد آدرشیوں کی حالت میں ناسٹلجیائی رجحانات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے- ناسٹلجیائی رجحان کے تحت اردو ادب میں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر اور ناصر کاظمی اہم حوالے ہیں۔ ہجرت کے کرب نے جن ادباء اور سماجی دانشوروں کو براہ راست متاثر کیا ہے اس کا اظہار ان کے تخلیقی فن پاروں میں شدت سے دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔ احمد مشتاق کا ایک شعر اس مناسبت سے کہ

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

انسانی زندگی مختلف رجحانات، تحریکوں اور فکری جہات کا مجموعی ہوتی ہے- انسانی زندگی اور سماج سے متعلق انسانی رویے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر شخص ان مختلف رویوں کا مجموعہ ہوتا ہے- تخلیق کار کے ہاں مختلف رویے اور نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ناسٹلجیا کا رجحان کسی شخص میں کسی بھی عمر میں نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ شدت سے اس رجحان کا شکار ہو کر اظہار کرتے ہیں کچھ نہیں کرپاتے ہیں لیکن ان تاثرات کا درآنا فطری بتایا جاتا ہے اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم پرویز لکھتے ہیں کہ

> "ناسٹلجیا ایسی چیز ہے جس سے کسی انسان کو مفر نہیں- اس کے لیے کسی خاص ذہنی سطح کی قید بھی نہیں- یہ کم وبیش ہر شخص کا مقدر ہے خواہ وہ کوئی بھی دانش ور ہو یا عام آدمی- ہاں فرد واحد کے ہاں اس کے درجات مختلف ہوسکتے ہیں، اس کے انفرادی جذبات اور احساسات کے تعلق سے- ناسٹلجیائی ایک عام سطح تو ماضی کی یادیں ہیں- اس سے کچھ اوپری سطح، کچھ لوگوں کے ہاں اپنے ماضی میں جینے کا رجحان ہے جسے انگریزی میں (living in one's past) کہا جاتا ہے۔"[۱]

ناسٹلجیائی رجحان کے پس منظر میں تہذیبی، اقدار، سیاسی و سماجی اور رومانوی عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ رومانوی فضا میں آدمی ماضی کے سنہرے یادوں میں جاتا ہے۔ ماضی کی بازیافت کرتا دکھائی دیتا ہے- ماضی کے جھروکوں سے حال میں آسودگی محسوس کرتا ہے۔ دوسری جانب سیاسی سماجی عدم توازن اور تہذیبی اقدار کے زوال کے وقت میں آدمی ماضی کی روایات، اقدار کا موجودہ عہد کے ساتھ تقابل کرتا ہے ایسے میں حال کی تلخی، گھٹن سہنے اور محسوس کرنے میں

کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان کے تحت کسی بھی سماج کے تہذیبی، نفسیاتی اور سماجی موضوعات کی بازیافت ممکن ہوتی ہے۔ اس حوالے سے عاصم بٹ لکھتے ہیں کہ:

"ناسٹلجیا خود کو دہرانے کی خواہش کا نام ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ ماضی سے مراد اپناوہ سب کچھ جو ہو چکا ہے اور وہ سب کچھ جو پہلے سمجھا۔ اس کی طرف لوٹنے کی خواہش ناسٹلجیا ہے۔"[۷]

دیکھا جائے تو ناسٹلجیائی رجحان ماضی کی بازیافت، تہذیبی اقدار کی پامالی اور انسانی یادوں کو دہرانے کا متقاضی زاویہ ہے۔ کوئی شخص کہیں بھی جائے تو وہ اپنے علاقے سے کٹ نہیں سکتا۔ ایک عرصے بعد جاکر آدمی کے دل میں کسک پیدا ہوتی ہے اگر وہاں جاکر دیکھتا ہے تو آدمی کی عجیب و غریب حالت ہوتی ہے۔ آدمی کے سامنے دھندلی دھندلی سی تصویریں آنا شروع ہو جاتی ہے۔ آدمی چند سیکنڈ میں ماضی کے ان جھروکوں میں پہنچتا ہے جہاں سے نکلے چار دہائیاں گزر چکی ہوتیں ہیں۔ اس عجب سے محسوسات کو ناسٹلجیائی قید کر کے تحریر میں لاتا ہے۔ اس حوالے سے احمد سہیل لکھتے ہیں:

" ناسٹلجیا کا مفہوم ہمارے یہاں " خانہ اداسی "سے لیا جاتا ہے جو یکسر غلط ہے - خانہ اداسی سے مراد (home sickness) ہے یہ کہ ناسٹلجیا جو بظاہر (لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے) حقیقتاً دو یونانی لفظ notes بمعنی" واپسی" اور "algos بمعنی "درد" کے ہیں سے مل کر بنتا ہے۔ لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی "درد آلود واپسی" ہوگا۔"[۸]

ناسٹلجیائی رجحان مربوط زاویہ فکر کے ساتھ اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے - یہ انسان کے جذبات احساسات اور مشاہدات و تجربات سے وابستہ ہو کر انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے- کسی تحریر میں ناسٹلجیائی رجحان کے محرکات میں عصری سیاسی سماجی صورت حالات، عصری تلخی، سکون اور راحت کی تلاش، تہذیبی روایات، اقدار کی پامالی، انسان کی بے توقیری، فرد کے داخلی خارجی معاملات میں کشمکش اور انتشار کے سبب ذہنی خلل اور ناسٹلجیائی کیفیت کا اظہار سامنے آتا ہے۔

یادیں انتہائی پراسرار انداز میں انسانی زندگی کی خالی جگہوں کو پر کرتی ہے۔ اگر یادوں کی فصل کو کیڑا لگ جائے تو انسانی زندگی اپنے ایک خوب صورت عنصر کی عدم موجودگی کے صدمے سے نڈھال ہو جاتی ہے اور محبت وانس کا پھول مرجھا جاتا ہے۔ یادوں سے خالی فضا میں لاتعلقی کی بے رحم آندھیاں شاندار انسانی جذبوں کو خزاں رسیدہ پتوں کی مانند اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتی ہیں شاید بہت لوگوں کو اس بات کا احساس ہوگا کہ آج کل کی ڈیجیٹل فضا یادیں پالنے کے لئے انتہائی ناساز گار ہے اور یادیں بھی مسلسل مرتی جارہی ہیں یادوں کی بے وقت موت سے زندگی کے حسین تسلسل کو خطرات درپیش ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "خاکم بدہن" کے کردار "صبغے اینڈ سنز" یعنی صبغت اللہ میں ناسٹلجیائی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہ کردار ماضی کی روایات، اقدار اور اشیاء سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہے۔ نسل نو کے رجحانات ترجیحات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کتابوں کی اہمیت، نوعیت، سنجیدگی کا معیار اور علمیت کے لحاظ سے کلاسیکی مصنفین کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔ دور حاضر کے لکھاری، شعراء اور پڑھنے والوں کی ترجیحات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں:

> "دکان کیا تھی، کسی بگڑے ہوئے رئیس کی لائبریری تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے چن چن کر وہی کتابیں دکان میں رکھی ہیں جو خود ان کو پسند تھیں اور جن کے متعلق انھوں نے ہر طرح اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ بازار میں کوئی مانگ ہے نہ کھپت۔۔۔ یار اگر عام پسند کی بھی دو چار کتابیں رکھ لیتے تو گاہک دکان سے اس طرح نہ جاتے جیسے سکندر دنیا سے گیا تھا۔۔۔ دونوں ہاتھ خالی!
> "تاجرانہ تبسم کے بعد فرمایا" میں صرف معیاری کتابیں بیچتا ہوں۔"[۹]

"صبغے اینڈ سنز" کے رویے میں ناسٹل جیا کا عنصر نمایاں ہے۔ ہر شخص نفسیاتی اعتبار سے احساس برتری کا شکار ہے۔ ہر جدید فن پارے یا شاعر کو اس بنیاد پر نظر انداز کرنا کہ ان کے ہاں سطحی رومانوی تصورات پائے جاتے ہیں دوسری جانب دیوان غالب کے ساتھ عشق محبت کا پہلو نمایاں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے اس رویے کے دونوں پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ اس کا بیان ان الفاظ میں ہوتا ہے:

> "ایک دن میں نے پوچھا اختر شیرانی کی کتابیں کیوں نہیں رکھتے؟ مسکرائے۔ فرمایا وہ نابالغ شاعر ہے۔ میں سمجھا شاید minor poet کا وہ یہی مطلب سمجھتے ہیں۔ میری حیرانی دیکھ کر خود ہی وضاحت فرمائی کہ وہ وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا کوئی بچہ ٹافی مانگ رہا ہے۔۔۔ بہت سی کتابیں وہ اس لیے نہیں رکھتے تھے کہ ان کو سخت ناپسند تھیں اور ان کے مصنفین سے وہ کسی نہ کسی موضوع پر ذاتی اختلاف رکھتے تھے لیکن معدودے چند مصنفین جو اس معتوب و مغضوب زمرے سے خارج تھے ان کی کتابیں دکان میں رکھتے ضرور تھے، مگر کوشش یہی ہوتی کہ کسی طرح بکنے نہ پائیں، کیونکہ وہ انھیں بے حد پسند تھیں اور انھیں سنگوا سنگوا کر رکھنے میں عجیب روحانی لذت محسوس کرتے تھے۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دیوان غالب (مصور) دکان میں مہینوں پڑا رہا۔ محض اس وجہ سے ان کا خیال تھا کہ دکان اس کے بغیر سونی سونی معلوم ہوگی۔ مرزا کہا کرتے تھے کہ ان کی مثال اس بدنصیب قصاب کی سی ہے، جسے بکروں سے عشق ہو جائے۔"[۱۰]

صبغے اینڈ سنز یعنی کہ صبغت اللہ ایک کلاسیکی مزاج کتب فروش ہے۔ اپنی دکان میں اپنی مزاج اور شوق کے عین مطابق کتابیں رکھنے کا شوقین ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ایک کتاب دوستی کا پہلو ہے لیکن جدید دور کے پڑھنے والوں سے ان کو خاصی شکایات ہیں جدید پڑھنے پڑھانے والوں کے رجحانات اور ترجیحات کو ایسے انداز سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں

کہ اس میں ایک خود اعتمادی اور نسل نو کے رجحانات کا مذاق اڑانا۔ جدید نسل کے ساتھ ہم آہنگی اور ان کے رجحانات کے برعکس کتابیں پڑھنا اور فروخت کے لئے اپنے پاس رکھنا یہ ایک خلا کی وجہ بنتا ہے نئے پڑھنے پڑھانے والوں کی ترجیحات کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"ایک مظلوم صورت کلرک یہاں آیا اور مجھے اس کونے میں لے جا کر کچھ شرماتے، کچھ لجاتے ہوئے کہنے لگا کہ کرشن چندر ایم اے کی وہ کتاب چاہیے، جس میں "تیری ماں کی دودھ میں حکم کا اکا والی گالی ہے۔ خیر، اسے جانے دو کہ اس بچارے کو دیکھ کر واقعی محسوس ہوتا تھا کہ یہ گالی سامنے رکھ کر ہی اس کی صورت بنائی گئی ہے۔ مگر ان صاحب کو کیا کہو گے جو نئے نئے اردو لیکچرر مقرر ہوئے ہیں۔ میرے واقف کار ہیں۔ اسی مہینے کی پہلی تاریخ کو کالج سے پہلی تنخواہ وصول کر کے سیدھے یہاں آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ لگے پوچھنے، صاحب! آپ کے ہاں منٹو کی وہ کتاب بھی ہے جس میں "دھرن تختہ" کے معنے ہوں؟ اور ابھی پرسوں کا ذکر ہے ایک محترمہ تشریف لائیں۔ سن یہی اٹھارہ انیس کا۔ نکلتا ہوا فربہ بدن۔ اپنی گڑیا کی چولی پہنے ہوئے تھیں۔ دونوں ہتھیلیوں کی رحل بنا کر اس پر اپنا کتابی چہرہ رکھا اور لگیں کتابوں کو ٹکر ٹکر دیکھنے۔ اسی جگہ جہاں تم کھڑے ہو۔ پھر دریافت کیا کوئی ناول ہے؟ میں نے راتوں کو نیند حرام کرنے والا ایک ناول پیش کیا رحل پر سے بولیں، یہ نہیں، کوئی ایسا دلچسپ ناول دیجئے کہ رات کو پڑھتے ہی نیند آجائے۔۔۔۔ انھیں گہرے سبز گردپوش والی کتاب کی تلاش تھی، جو ان کی خواب گاہ کے سرخ پردوں سے "میچ" ہو جایے۔ اس سخت معیار پر صرف ایک کتاب پوری اتری۔ وہ تھی "استاد موٹر ڈرائیوری" (منظوم) جس کو دراصل اردو زبان میں خودکشی کی آسان ترکیبوں کا پہلا منظوم ہدایت نامہ کہنا چاہیے۔"[۱۱]

صبغے اینڈ سنز یعنی صبغت اللہ کا المیہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک سمیت کتابوں کی معیاری اقدار نہیں ہے۔ کتاب میں اقدار، روایات اور علمیت کا فقدان مانتے ہیں۔ کتاب کلچر کو صرف پراپیگنڈہ ادب سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کتاب کی اہمیت اور علمیت صرف کلاسیکی کلام اور مصنفین تک ہے۔ جدید معاشرے کے رجحات اور کتابوں کی علمیت دنیا بھر سے لے کر اپنے مقامی تک کارد پیش کرتے ہیں۔ کتابوں کی مقبولیت اور اس کے حوالے سے اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ نئی بات غلط ہے، سطحی اور اس کی علمی سطح پست ہے۔ یہ علمی دنیا کا زوال ہے۔ یہ کردار اپنی نوعیت کے اعتبار سے ثقافتی اور تہذیبی ناسٹلجیا کا شکار ہے۔ اس کردار کے ذریعے یوسفی نے ناسٹلجیا کے منفی رویے کو منفی دکھایا گیا ہے۔ ماضی کا بھوت صرف قصوں اور کہانیوں کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ اپنے ارد گرد کے چیزوں اور لوگوں سے بند کرنے کی بھی ایک صورت ہوتی ہے۔ یہ کردار احساس برتری کا شکار ہو کر جب جدید رجحانات اور تقاضوں کے مطابق نہیں چلتا تو آخر میں دکان ختم کرتا ہے مضمون ختم ہوتے ہی قاری کی ہمدردی صبغے

اینڈ سنز سے پیدا ہوتی ہے کہ جدید رجحانات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے روایتی اور کلاسیکی کتابوں تک محدود رکھتے ہوئے نقصان اٹھانا پڑا۔ ان تمام صورت حال کا اظہار یوں ہوتا ہے:

" ترقی یافتہ ممالک کی ادب نوازی و علم دوستی کے چرچے رہنے لگے۔ ایک دفعہ برادران وطن کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا" آپ کے ہاں تو ابھی تک جہالت کی خرابیاں دور کرنے پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر ترقی یافتہ ممالک میں تو اب مارا مار ا ایسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں جن کا مقصد ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جو محض جہالت دور ہونے سے پیدا ہو گئی ہیں۔ صاحب! وہاں علم کی ایسی قدر ہے کہ کتاب لکھنا، کتاب چھاپنا، کتاب بیچنا، کتاب خریدنا، حد یہ کہ کتاب چرانا بھی ثواب میں داخل ہے۔یقین مانیے، ترقی یافتہ ممالک میں تو جاہل آدمی ٹھیک سے جرم بھی نہیں کر سکتا" شامت اعمال میرے منہ سے نکل گیا،" یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں کوئی کتاب اس وقت تک اچھی خیال نہیں کی جاتی، جب تک کہ اس کی فلم نہ بن جائے اور فلم بننے کے بعد کتاب پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔۔۔ آپ کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ نوجوان اس وقت تک اردو کی کوئی کتاب پڑھنے کی حاجت محسوس نہیں کرتے، جب تک پولیس اسے فحش قرار نہ دے دے اور فحش قرار پانے کے بعد اس کے بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ پولیس اگر دل سے چاہے تو تمام اچھی اچھی کتابوں کو فحش قرار دے کر نوجوانوں میں اردو ادب سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔۔۔ اگر ایک پوری کی پوری نسل کو ہمیشہ کے لیے کسی اچھی کتاب سے بیزار کرنا ہو تو سیدھی ترکیب یہ ہے کہ اسے نصاب میں داخل کر دیجیے۔۔۔ آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ادب ایک کیپ سول میں بند کر کے ان کے حوالے کر دیا جایے، جسے وہ کوکا کولا کے گھونٹ کے ساتھ غٹک سے حلق سے اتار لیں۔ انسانی تہذیب پتھر اور بھوج پتر کے عہد سے گزر کر اب ریڈرز ڈائجسٹ کے دور تک آ گئی ہے۔ سمجھے؟ یہ مصنفوں کا دور نہیں، صحافیوں کا دور ہے! صحافیوں کا! میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا" مگر صحافت میں کیا قباحت ہے؟" بولے" کچھ نہیں۔ بڑا مصنف اپنی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے، مگر بڑا صحافی پبلک کی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے!"[۱۲]

صبغے اینڈ سنز کی دکان کی آخری لمحات قابل رحم ہوتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے مصنف اس کردار سے اظہار ہمدردی کر رہا ہے اور ناسٹل جیا کے منفی پہلو کی جانب توجہ مرکوز کر رہا ہے:

" صبغے غریب کے حصے میں صرف اپنے نام (مع فرضی فرزندان) کا سائن بورڈ آیا جس کو سات روپے مزدوری دے گھر اٹھوا لائے اور دوسرے دن سوا روپے میں محلے کے کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔۔۔ مرزا کے الفاظ میں صبغے کی کتب فروشانہ زندگی کے باب کا انجام نہایت افسانوی رہا"[۱۳]

ناسٹلجیائی کیفیت اس وقت شدت اختیار کرتی جب انسان کو اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کا ماضی تو حال سے بہتر تھا ایسے غیر یقینی صورت حالات میں انسان ماضی کی یادوں کا سہارا لیتا دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات و واقعات کی ترجمانی "زرگزشت" کے ایک کردار "عبدالرحمن قالب" کی زبانی

> " عباد الرحمن قالب بلند شہری، ثم ٹونکی، ٹونک کے میونسپل کمیٹی میں متصدی تھے۔ مشاہرہ ۳۰روپے چنور شاہی کہ جس کے ۲۰روپے کلدار بنتے تھے۔ مگر یہ نشہ کیا کم تھا کہ چار دانگ ٹونک میں کوئی کتا ان کی منشا کے بغیر بھونک نہیں سکتا تھا۔ اور نہ کوئی پرنالہ ان کی منشا کے بغیر غلط جگہ گر سکتا تھا۔ اپنی متروکہ حویلی سے زیادہ اس شفیق نیم کو یاد کرتے جسے آنگن میں سر جھکائے تنہا کھڑا چھوڑ آئے تھے، کہتے تھے مکان کے عوض مجھے مکان الاٹ ہو گیا۔ لیکن حکومت وہ نیم کہاں سے لائے گی جس کی چھاؤں میں نیند کی پریاں جھولا جھلاتی تھیں۔ جس کے نیچے ایک بچے نے نبولیوں سے آم کی دکان لگائی تھی۔ جہاں بہنیں گڑیاں کھیلیں۔ شادی کی شہنائی بجی۔ باپ کا جنازہ رکھا گیا۔ پھر اسی بوڑھے نیم کی سینک سوگوار ماں نے کانوں میں پہن لی۔ روایت ہے، اورنگ زیب عالمگیر نے جب یہ خبر سنی کہ کشمیر کی تاریخی مسجد میں آگ لگ گئی ہے تو اس نے کہا مسجد تو دوبارہ تعمیر ہو جایے گی لیکن صحن مسجد کے چنار جل گئے تو ایک ہزار عالمگیر بھی ایک بوڑھا چنار پیدا نہیں کر سکتے۔ اب انھیں کون بتاتا کہ یادوں کے ایسے بوڑھے نیم تو ہر گاؤں، ہر دل کے آنگن میں سایہ فگن ہوتے ہیں۔ ہاں جب دل کی آگ بجھ جائے تو ان کی جڑیں شریانوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔ "[۱۴]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کی نفسیات کو ایسے بیان کیا ہے کہ کرداروں کی رنگین تصویریں سامنے آتی ہے کرداروں کا تعلق ارد گرد معاشرے میں چلتے پھرتے کردار محسوس ہوتے ہیں - اس طرح کا ایک کردار "خان سیف الملوک" بھی ہے جو کہ ایک عام انسان اور ایک عام انسان کے تصور غم و تصور حیات کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

> "زندگی کو انہوں نے کیا دیا؟ اب جو غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی تنگی، اتنی محرومی اور ایسی تنہائی کے باوجود کتنے مطمئن و مسرور تھے۔ کتنی خوشیاں، کیسی کیسی خوشبوئیں بکھیرتے چلے گئے کہ آج دامن میں نہیں سمتیں۔ پھول جو کچھ زمین سے لیتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اسے لوٹا دیتے ہیں۔ "[۱۵]

ہجرت کرنے سے انسان کا معروض ضرور بدل جاتا ہے - نئے ماحول سے ایڈجسٹ ہونے میں وقت تو لگتا ہے انسان لاشعوری طور پر کسی نہ کسی صورت میں اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے - ملک چھوڑنے سے ماحول تو بدل جاتا ہے لیکن دل و دماغ میں گزرے ہوئے وقت کی فلم چلتی ہے ان یادوں کا اظہار ضروری نہیں کہ تحریر یا زبان سے کیا جائے کسی موقع پر دل کی بات زبان پر آ ہی جاتی ہے یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیائی رجحان ایک متوازن صورت میں دکھائی دیتا ہے - ایسا

نہیں ہے کہ گزرے ہوئے وقت یا عہد کو یاد کرنا غلط بات ہے لیکن ماضی کو یاد کرتے ہوئے معتدل مزاجی اہم چیز ہوتی ہے کہ ماضی کی تکرار بوجھل کیفیات کا سبب نہ بنے۔یوسفی ٹونک سے ہجرت کرکے پاکستان آتے ہیں۔ہجرت کے تجربے کو خوب صورت الفاظ میں یوں کرتے ہیں:

"وہ صبح نہیں بھولے گی جب ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل "پاکستان" لکھا نظر آیا تو اسے ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھا تھا۔ پھر مٹی اٹھا کر دیکھی۔ اسلام علیکم کہتے ہوئے سندھی ساربان دیکھے۔ ہندوستان کے نوٹ پر پہلی دفعہ حکومت پاکستان چھپا ہوا دیکھا۔ اور پھر ریگزار راجھستان میں پرکھوں کی قبریں، وہ بولی جو ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے، خیر گئی امروز میں دھندلانے چلے گئے "[۱۶]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر کا ناسٹلجیا کے تناظر میں تجزیے کا مقصد یہ ہے کہ ناسٹلجیا کو کسی فرد، قوم یا معاشرے اور تہذیب کے لئے ایک منفی رجحان کی بجائے مثبت رویہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ناسٹلجیا کی اصطلاح زیادہ تر نفسیات میں ذہنی امراض کو سمجھنے کے لیے استعمال کی جاتی رہی۔ نقل مکانی کرنے والوں، جنگوں میں اپنے پیاروں سے، بچھڑ جانے والوں، خانہ بدوشوں کے لئے یہ کیفیت منفی رجحان کے طور پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اول اول میں اس کو نفسیاتی بیماری کے طور پر استعمال کیا گیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادیبوں کے ہاں اپنے داخلی طرز احساس کو ماضی کی روشنی سے منور کرنے اور تخلیقی تجربے کا حصہ بنا کر ایک برتر ذہنی سطح کا اظہار سمجھا گیا۔ ہر انسان زندگی میں کئی طرح کی کیفیات سے گزرتا ہے۔ خوشی، غمی اور حیرت سب انسانی زندگی کے امکانات میں ہیں۔ ناسٹل جیا بھی ایسی ہی کیفیت اظہار اور داخلی طرز احساس کا نام ہے۔ جس میں فرد ماضی کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے۔ ماضی کی حسین یادیں اس کے تعاقب میں رہتی ہے۔ ان حالات وواقعات کی عکاسی "زرگزشت" میں یوں ہوتی ہے:

"آپ کا من ابھی تک میر آآئی کے دیس میں اٹکا ہوا ہے، پنڈت یوسفی! ریت کے ٹیلے، بنجر زمین، اونٹ، حد یہ کہ ٹھ، ڈھ، ڑھ دیکھ کر آپ ناسٹل جک، ہو جاتے ہیں! آپ کے دیس جے پور میں لے دے کے ایک جھیل تھی۔ سانبھر جھیل۔ اور یہ سڑاندی کھاری جھیل ہے جو سارے ہندوستان کو نمک سپلائی کرتی ہے۔ آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ برہمنوں کا دھرم اپنی رسوئی میں مسلمان کے تھاپے ہوئے اپلے جلانے سے بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ پاکستان کا دانا پانی کھاتے اتنے دن ہو گئے۔ مگر اب بھی وہی رٹ "میں چنے مٹر کے کھالوں گی تو لے چل جمنا پار" تھان ہے تھان! یہ پاکستان ہے۔ آپ بھی کس بولی، پلپلی، پوپلی زمین کو یاد کرتے ہیں۔ "[۱۷]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیائی رجحان کرداروں کے رویوں اور کرداروں کی نفسیاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے انسانی جذبات واحساسات میں توازن کے بگڑنے سے انتشار پیدا ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ تخلیق کار کسی

واقعے کے زیر اثر ایک پہلو اجاگر کرتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ماضی پرستی کے تکنیک پر لکھے گئے فن پاروں میں زیادہ تر ماضی کی یادوں کا حاوی رہا ہے۔ ماضی کا بھوت سر پر سوار ہو جائے تو گزرے ہوئے عہد کے واقعات اور کرداروں کے ذریعے کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ لمحہ موجود کے تقاضوں، رجحانات اور دیگر لوازمات زندگی سے فرار والی کیفیت ہوتی ہے۔ زیادہ تر دیکھا گیا ہے کہ ناسٹل جیا ایسے وقت کی آرزو اور خواہش کا باعث بنتا ہے جو کہ کبھی دوبارہ لوٹ نہیں سکتا ۔ناسٹلجیا حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کر کے ماضی میں پناہ لینے کا ایک پہلو ہے۔

ناسٹلجیائی رجحان کے مثبت اور منفی رویوں کو یوسفی نے اپنے کرداروں کے ذریعے دکھایا ہے کہ کس طرح کردار ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو کر حال سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں-ماضی کی مجرد یادوں اور روایات سے چمٹے رہنے سے ارد گرد لوگ کیا سوچتے ہیں۔ اس طرح منفی رویے کا آپ کی شخصیت کے علاوہ ارد گرد معاشرے اور افراد پر اثرات کی نوعیت کیسی ہوتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی نثر اور کرداروں کے رویوں میں ناسٹلجیائی رجحان اپنے معاصرین سے مختلف ہے۔ تقسیم ہجرت کے تلخ تجربے کو برداشت کرتے نظر آتے ہیں۔ پاکستان میں رہ کر یادوں کے سہارے ٹونک راجھستان کو یاد کرتے ہیں لیکن اس میں ایک متوازن رویہ اختیار کر کے دیکھے اور پڑھے جاسکتے ہیں۔ماضی انسان کی یادوں میں زندہ رہتا ہے ۔اس کے مثبت اور منفی پہلو ہو سکتے ہیں۔ خوش گوار تو کبھی دل کو بوجھل کرنے والا امکان ہے کہ یہ ڈھلتی عمر کا احساس ہو، عمر انسان کئے گئے فیصلوں، جذبات اور گفتگو پر اثر ڈالتی ہے۔ خیالات بدل جاتے ہیں۔ خوابوں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے ۔ انتظار کی تاب نہیں رہتی، سوچ میں ٹھرے پانی کا سا سکوت آجاتا ہے لیکن اس کا دوسرا رخ بھی ہو سکتا ہے کہ عمر بعض لوگوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پاتی ہے۔ ان کے خیالات، خواب اور انتظار کی شدت سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے کہ جیسا پہلے تھا۔ یہ اپنے جذبے، شعور اور رویوں کو منفی سرگرمیوں سے باز رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہ حوصلہ مندی ہر دور کے مشکلات اور حالات کا سامنا کرنا جان لیتی ہے۔ ان دو پہلوؤں میں جب انسان عدم توازن کا شکار ہوتا ہے تو جذبات کی رو میں بہہ کر حالات کا شکار ہو جاتا ہے۔ناسٹلجیا کا عنصر تب شدت اختیار کرتا ہے جب انسان کا ماضی حال سے بہتر محسوس ہونے لگتا ہے تو ایسے میں حال سے مایوسی اور حال کی ناقدری کے سب انسان اپنے ماضی کے ان حالات میں پناہ لیتا ہے جس میں جانا ناممکن ہے لیکن حال کی تلخی کو کم کرنے کا یہ ایک موثر طریقہ کار ہوتا ہے۔ ان حالات کی عکاسی قبلہ کے ذریعے "آب گم" میں یوں ہوتی ہے:

> "کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول، بے روز گاری، بے گھری اس پر مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھچوا لائے تھے۔ "ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے۔ اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے"۔ ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں" جن دفتروں میں مکان کے الاٹمنٹ کی درخواستیں دی تھیں ان کے بڑے افسروں کو بھی

کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوت استحقاق دکھاتے: "یہ چھوڑ کر آئے ہیں" واسکٹ اور شیروانی کی جیب اور کچھ ہو یا نہ ہو، حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ درحقیقت ان کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔" [۱۸]

یوں دیکھا جائے تو یوسفی نے "قبلہ" کردار کے ذریعے ہجرت کرنے والے ایک طبقے کے خیالات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ ہجرت کے بعد مہاجرین کس قدر پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ بعد از ہجرت کے تلخ تجربات اور مشاہدات کو قبلہ کے زبانی دکھایا گیا ہے۔ دکھ، محرومی اور بے قدری جب روح میں سرایت کر آئے تو قبلہ کی تصویر بنتی ہے اس کا اظہار کچھ یوں ہوتا ہے:

"یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔۔۔۔ یاد رکھو، غصہ جتنا کم ہو گا، اس کی جگہ اداسی لیتی چلی جائے گی۔ اور یہ بڑی بزدلی کی بات ہے۔ بزدلی کے ایسے ہی اداس لمحوں میں اب انہیں اپنا آبائی گاؤں جہاں بچپن گزارا تھا، بے تحاشا یاد آنے لگتا۔ واماندگی زیست نے ماضی میں اپنی پناہیں تراش لیں۔ گویا البم کھل گیا۔ دھندلانے سیپیا رنگ کی تصویریں چشم تصور کے سامنے بکھرتی چلی جاتیں۔ ہر تصویر کے ساتھ زمانے کا ورق الٹتا چلا گیا۔ ہر اسنیپ شاٹ کی اپنی ایک کہانی تھی۔" [۱۹]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں فکری موضوعات کا تنوع ہے۔ مزاح کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے غم کی کیفیت کشید کرتے ہیں۔ فرضی کرداروں کے ذریعے سماجی رویوں اور عصری رجحانات پر مکالمہ کرتے ہیں۔ ناقدین نے مشتاق احمد یوسفی پر عورت مخالف اور ناسٹل جیک کا لیبل لگانے کی کوشش کی ہیں۔ اس موقف کے دلیل میں "آب گم" کے پیش لفظ میں یوسفی کے زبانی والا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یوسفی کی نثر میں ماضی پرستی وہی روایتی منصوبے میں نہیں بلکہ ماضی کی روایات، اقدار، حال سے مایوسی اور ناامیدی کو شدت سے نہیں ایک ہلکے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ "آب گم" کتاب کو جب ماضی پرستی اور ناسٹل جیا کے موضوع تک محدود کیا گیا تو اس رویے پر ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہے کہ:

"آب گم کے مطالعے کے بعد اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ اس کا موضوع ناسٹل جیا ہے۔ اس کتاب کے چند اہم کرداروں کا حال کی تلخیوں اور ناکامیوں سے گھبرا کر ماضی کی تخیلی راحتوں اور عظمتوں میں پناہ لینے کا رویہ ناسٹل جیک ماحول ضرور فراہم کرتا ہے۔ مگر یہ کتاب بنیادی طور پر ماضی پرستی کے گرد نہیں گھومتی بلکہ مشرقی اقوام کی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی بدحالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کم حوصلگی، تہی دامنی اور بے عملی کا دردمندی اور دلسوزی سے جائزہ لیتی ہے اور اگر صرف ایک ہی لفظ میں اس کے موضوع کو سمیٹا جا سکتا ہے تو پھر اس کتاب کا

موضوع انسان اور اس کی زندگی ہے۔ درماندہ، خستہ حال، شکستہ دل، بچھڑی ہوئی، اکھڑی ہوئی، سسکتی اور بے ثمر فریاد کرتی زندگی۔۔۔۔ کیچڑ میں ملی، موتیوں کی سی آب و تاب والی، آس امید کے پتوار چلاتی، آگے بڑھتی زندگی۔۔۔۔ انتہائے غم کو حوصلہ مندی سے مسکرا کے ٹال دیتی زندگی۔۔۔۔ یہ بیسویں صدی کے گلوبل ولیج اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں وقت کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جانے والے دلوں کا مرثیہ ہے۔ تیز رفتار جیٹ انجن اور بلٹ ٹرین کے پہیوں تلے کچلی ہوئی کسالت زدہ معاشرت کا نوحہ ہے۔ زندگی سے نظر چرا کر، خود اپنے اندر کوئی اور جہان آباد کر کے اس جینے والے الم نصیب لوگوں کا نغمہ خود پرستی ہے، یہ افلاطون کے اس غار کی تمثیل ہے جس میں ہر کوئی حقیقت کا صرف عکس دیکھ پاتا ہے کیونکہ روشنی کی طرف اس کی پشت ہے، چہرہ نہیں۔"[۲۰]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں فکری و سماجی موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔یوسفی خود کو مرکزی کردار سے زیادہ ارد گرد کے لوگوں اور واقعات ہی کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی مثال "زرگزشت" ان کی سوانح عمری ہے۔ عموماً سوانح عمری میں مصنف اپنی زندگی اور خود سے وابستہ یادوں کو لکھتے ہیں لیکن یوسفی "زرگزشت" میں واضح طور پر اپنی کتاب کو عام آدمی کی کہانی قرار دیتے ہیں۔ "زرگزشت" میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ سرگزشت ایک عام آدمی کی کہانی ہے، جس پر بحمد اللہ کسی بڑے آدمی کی پرچھائیں تک نہیں پڑی۔ ایک ایسے آدمی کے شب و روز کا احوال جو ہیرو تو کجا ANTI HERO ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ عام آدمی تو بے چارہ اتنی بھی سکت اور استطاعت نہیں رکھتا کہ اپنی زندگی کو مردم آزاری کے تین مسلمہ ادوار میں تقسیم کرکے۔یعنی جوانی میں فضیحت، ڈھلتی عمر میں نصیحت اور بڑھاپے میں وصیت۔"[۲۱]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کی نفسیات اور نفسیاتی پہلوؤں کو دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ ایک عام آدمی کے تصورِ زندگی، تصورِ غم اور انسانی زندگی کے عمومی واقعات کو کتنی باریکی سے بیان کرتے ہیں۔بظاہر وہ مزاح کے اسلوب میں اپنی بات کرتے ہوئے غم کشید کرتے ہیں۔اس کی مثال مولوی کرامت حسین کے مرحوم والد کے انتقال کے بعد کی صورت حال کے تناظر میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"ایک شخص خبر لایا کہ کل شام مولانا کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آج ظہر و عصر کے درمیان جنازہ اٹھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ چلو اچھا ہوا۔ اللہ نے بچارے کی سن لی۔ برسوں کی جان کنی ختم ہوئی۔ مٹی عزیز ہوئی۔ بلکہ یوں کہیے، کیچڑ سے اٹھا کر خشک مٹی میں دبا آئے۔ وہ تعزیت کے لیے سیدھا مولانا کے گھر پہنچے۔۔۔۔ جھگیوں کی پہلی قطار کے سامنے ایک نیک نیت خداترس، باریش بزرگ قورمہ اور تنوری روٹیاں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو وہ رکشا میں رکھ کر لائے

تھے۔ تین لحاف بھی مستحقین میں بانٹنے کے لیے ساتھ لائے تھے۔ وہ گھر سے چلے تو اندازہ نہیں تھا کہ بیس ہزار کی بستی میں تین لحاف لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی انجکشن کی سرنج سے آگ بجھانے کی کوشش کرے۔۔۔ وہ سوچنے لگے، تم ایک شخص کو پرسا دینے چلے تھے، یہ کس دکھ ساگر میں آنکلے - طرح طرح کے خیالوں نے گھیر لیا- بڑے میاں کو تو کفن بھی بھیگا ہوا نصیب ہو گا- یہ کیسی بستی ہے جہاں بچے نہ گھر میں کھیل سکتے ہیں، نہ باہر - جہاں بیٹیاں دو گز زمین پہ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے درختوں کی طرح بڑی ہو جاتی ہیں- جب یہ دلھن بیاہ کے پردیس جایے گی تو اس کے ذہن میں بچپن اور میکے کی کیا تصویر ہو گی؟ پھر خیال آیا کیسا پردیس، کہاں کا پردیس، یہ تو بس لال کپڑے پہن کر یہیں کہیں ایک جھگی سے دوسری جھگی میں پیر پیدل چلی جایے گی--- پھر ایک دن مینہ برستے میں جب ایسا ہی سماں ہو گا، وہاں سے آخری دو گز زمین کی جانب ڈولی اٹھے گی- اور زمین کا بوجھ زمین کی چھاتی میں سما جایے گا- مگر سنو! بندہ خدا! تم کاہے کو یوں جی بھاری کرتے ہو؟ کہیں اس طرح آنکھوں میں آنسو بھر کے دنیا کو دیکھا کرتے ہیں؟ درختوں کو کیچڑ گارے سے گھن تھوڑا ہی آتی ہے- کبھی پھول کو بھی کھاد کی بدبو آئی ہے؟" [۲۲]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کردار ایک دوسرے سے یوں مکالمہ کرتے ہیں کہ جیسے یہ معاشرے کے عام انسان ہیں ان کے مسائل اور معاملات کی نوعیت نجی ہونے کے باوجود معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں- عام انسانی واقعات پر کرداروں کے تاثرات کا بیان مصنوعی نہیں ہوتا- حقیقی معنوں میں مزاح کے پردے میں غم کشید کرنے کا ہنر یوسفی کی نثر کی معراج ہے- کرداروں کے رویوں میں ماضی کی جھلک اور ماضی کی کسک کا حال سے ایسا ربط جوڑتے ہیں کہ پڑھنے والا بوریت یا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا- کرداروں کے رویوں سے دکھایا جاتا ہے کہ کردار کا تعلق، کردار کا رہن سہن، ماحول، لہجہ، اس کی بول چال، رنگت، لباس اور طور طریقے یہاں تک کہ کرداروں کے رویوں سے محبت، انس، غصہ، غم اور جذباتی لگاو کو خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں- اس کی ایک مثال "خان اورنگزیب" اور "بشارت" کے ذریعے بیان کرتے ہیں کہ:

" لفظوں کی جنگ میں فتح کسی بھی فریق کی ہو، شہید صرف سچائی ہوتی ہے- خان صاحب کسی طرح رقم چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے- بشارت نے عاجز آکر یہاں تک کہا کہ کون صحیح ہے، کون غلط، اس کو بھول جایئے- یہ دیکھیے کہ آپ کا ہمارا بیوپار بیوہار آئندہ بھی رہے گا- پھر کبھی کسر نکال لیجیے گا- خدانخواستہ یہ آخری سودا تو ہے نہیں- اس پر خان صاحب بولے کہ خان سنگ مرجان خان نے مجھے نصیحت کی تھی کہ دوست سے ملو تو اس طرح ملو جیسے آخری ملاقات ہے- اب کے بچھڑے پھر نہیں ملیں گے- اور کسی سے سودا کرو تو یہ سمجھ کے کرو کہ آخری سودا ہے- دوبارہ یہ "دلا" نہیں آنے کا! شیخ سعدی کہتے ہیں کہ باؤلے سے باؤلا کتا بھی یہ امید نہیں رکھ سکتا کہ جسے اس نے کاٹا ہے وہ خود کو پھر کٹوانے کے لئے دوبارہ سہ بارہ آئے گا- ایک دفعہ بشارت کا

لہجہ کچھ تلخ ہو گیا اور انھوں نے بار بار "خان صاحب! خان صاحب!" کہہ کر لعن طعن کی تو کہنے لگے، دیکھو صیب! گالی گفتار کرنی ہے تو مجھے خان صاحب مت کہو- حاجی صاحب کہہ کے گالی دو، تا کہ مجھے اور تمہیں دونوں کو کچھ غیرت تو آئے- بشارت نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر پیشانی چوم لی۔"[۲۳]

یوسفی کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ کرداروں کے رویوں میں شامل فکری رجحانات ومیلانات اور عصری موضوعات کا منظر پیش کرتے ہیں- یوسفی کی نثر میں کرداروں کا شخصی ونفسیاتی مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کردار ایک خاص کیفیت اور ماحول کے زیر اثر پروان چڑھتے ہیں- انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں- شخصی نفسیاتی حوالوں سے کرداروں کا علاقائی لہجہ، طور طریقوں اور رہن سہن کو خوب صورت الفاظ میں دکھاتے ہیں- اس کی مثال "خان اور نگزیب" کے چند جملوں کی صورت میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"بشارت کا موقف تھا کہ میں نے یہ لکڑی سات ہزار میں گھاٹے سے بیچی ہے- خان صاحب فرماتے تھے کہ آپ کی آدھی لکڑی تو چور لے گئے- آدھی پولیس والوں نے بتھیلی- آپ اسے بیچنا کہتے ہیں اس کے لیے تو پشتو میں بہت برا لفظ ہے---اعصاب اس حد تک مضبوط تھے کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تھے ہی نہیں---دال کو ہندوانہ بدعت اور سبزی کھانے کو مویشیوں کی صریح حق تلفی سمجھتے تھے- کڑاہی گوشت کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کڑاہی گوشت کھائیں گے، بلکہ کڑاہی بھر کے کھائیں گے---ہم تو آزاد قبائلی آدمی ہیں - اردو تو ہم نے ڈوبی ہوئی "رقوماتوں" کی وصولی کے لئے، کراچی کے بیوپاریوں سے لڑائی دنگے کے دوران سیکھ لی ہے- چنانچہ ان کی ساری)vocabulary لفظیات)حالت امن میں بالکل نکمی اور ناکارہ ہو جاتی تھی"[۲۴]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کے ذریعے معاشرتی رویوں کی جھلک محسوس ہوتی ہے- خوشی، غمی، محبت، نفرت، لڑائی، صلح، قرض دینے والے، قرض واپس مانگنے والے اور معاملات زندگی میں اتار چڑھاؤ کو ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ چلتی پھرتی تصویریں محسوس ہوتی ہیں - یہ کردار اپنے رویوں میں شخصی اثرات کا تعلق اجتماعی کیفیات سے جوڑتے ہیں- اس کی مثال بشارت اور حاجی اورنگزیب خان کے مابین لڑائی اور صلح کی صورت میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

" آپ بھی تو کابلی والا سے کم نہیں" "یہ کیا ہوتا ہے صیب؟" بشارت نے کابلی والا کا مطلب بتایا تو وہ غضب ناک ہو گئے- کہنے لگے "ہمارے قبیلے میں آج تک کسی نے سود لیانہ سود دیا- خنزیر برابر سمجھتے ہیں- جب کہ آپ علانیہ سود دیتے بھی ہیں اور کھاتے بھی ہیں- آپ کے گھر کا تو شوربا بھی

حرام ہے-اس میں آدھا پانی، آدھی مرچیں اور آدھا سودہ ہوتا ہے!اگر آئندہ یہ لفظ منہ سے نکالا تو ٹھیک نہ ہو گا" [۴۵]

عصر حاضر میں پرانے دور کا ناسٹل جیا کسک بن کے چھپ رہا ہے-ماضی میں حد سے زیادہ کھو جانے اور ہر وقت یادوں میں ڈوبے رہنا ایسے حالات کی طرف اشارہ ہے جو کہ اپنے حال سے مطمئن نہ ہوں-انسانی لاشعور میں ماضی کے تجربات، خواہشات، حسرتوں اور نامکمل خوابوں کا انبار ہوتا ہے-لاشعور یادوں کا کباڑ خانہ ہے-جہاں آدمی گزرے عہد کے تجربات، واقعات اور حسرتوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی سنبھال کر رکھتا ہے-کبھی وہ بلیک اینڈ وائٹ ڈراموں کا دور، ریڈیو سے وابستہ رومانس اور ایسے بے شمار اشیاء جو کہ انسان کو ماضی کی طرف لے کر جاتی ہیں-وہ تمام تر عوامل انسان کے لاشعور کا حصہ ہوتے ہیں-لاشعور میں پڑے مواد کو یاد کر کے انسان اگر حال کو یکسر رد کرتا ہے تو ایسے میں حال اور ماضی کے مابین کشیدگی بڑھتی ہے-اور انسانی رویوں میں عدم توازن پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں-ماضی سلگنے والا ان بجھا شعلہ جب انسان کے ذہن کو دیمک کی طرح چاٹنے لگتا ہے تو انسان کو بند گلیوں میں لے کر جانے سے کوئی نہیں روک سکتا-یوں حقیقی زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیوں کہ خیالات کا تانا بانا صرف ماضی اور ماضی کے خوش گوار اور تلخ یادوں تک محدود ہو جاتا ہے-ماضی کے ان تجربات کا ہار گلے میں ڈال کر زندہ انسان معاشرے میں سانس لینا، آہیں بھرنا، ہجر کے دکھ سہنا اور اپنے ارد گرد انسانوں کے باوجود خود کو تنہا محسوس کرنا ہی ناسٹل جیا کا منفی پہلو ہے-

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیائی رجحان کے ان منفی رویوں کو شخصی و نفسیاتی تناظر میں دکھایا گیا ہے کہ ایک کردار ماضی کی چھتری تلے اپنی زندگی بسر کرتا ہے-ارد گرد لوگوں کے ساتھ اور سماج کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیسی ہوتی ہے-ان تمام عوامل کو "چراغ تلے" کے مضمون میں یوں بیان کیا ہے کہ:

"آغا ایک مدت مدید (تیس سال) کے بعد اپنے گاؤں گئے-لیکن وہاں سے لوٹے تو کافی آزردہ تھے-انھیں اس بات سے رنج پہنچا کہ جہاں پہلے ایک جوہڑ تھا جس میں دن بھر بھینسیں اور ان کے مالکوں کے بچے پڑے رہتے تھے، وہاں اب ایک پرائمری اسکول کھڑا تھا-اس میں انھیں صریحاً چاکسو کلاں والوں کی شرارت معلوم ہوتی تھی-جوں توں ایک دن وہاں گزارا اور پہلی ٹرین سے اپنی یونی ورسٹی پہنچے-مگر وہاں سے بھی شاموں شام واپس آئے-بے حد مغموم و گرفتہ دل-انھیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یونی ورسٹی اب تک چل رہی ہے!ان جیسے حساس آدمی کے لئے یہ بڑے دکھ اور اچنبھے کی بات تھی کہ وہاں مارچ میں اب بھی پھول کھلتے ہیں اور گلاب سرخ اور سبزہ ہرا ہوتا ہے-دراصل ایک مثالی "اولڈ بوائے" کی طرح وہ اس وقت تک اس

صحت مند غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ساری چونچالی اور تمام خوش دلی اور خوش باشی ان کی نسل پر ختم ہو گی۔"[۲۶]

مشتاق احمد یوسفی کی رویوں میں ناسٹل جیا کے فکری پہلوؤں کو دیکھا جائے تو دونوں پہلو دیکھے جاسکتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ کردار صرف ماضی کی کسک، ماضی کی تکرار، حال سے تعلق ختم کرتے ہوئے یادوں کے سہارے جیتے ہیں-دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ یوسفی نے کرداروں کے رویوں میں توازن کو برقرار رکھا ہے-یوسفی کے عہد میں ناسٹلجیائی رجحان کے تناظر میں جو ادب لکھا گیا ہے اس میں ماضی کا غلبہ حاوی دیکھا جاسکتا ہے-اس کی مثال میں انتظار حسین کا ناول "بستی" خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" اور ناصر کاظمی کی شاعری نمایاں ہیں-ان تخلیقات میں ماضی کی شدت زیادہ دکھائی دیتی ہے-لیکن مشتاق احمد یوسفی نے اپنی نثر میں ماضی کے بیان میں توازن برقرار رکھا ہے-ماضی کو یاد کرتے ہوئے جذبات اور گزرے ہوئے عہد کے حسین اور تلخ یادوں میں خود کو سنبھال رکھا ہے-ماضی کے مثبت اور منفی رویوں کو شخصی و نفسیاتی تناظر میں واضح کیا ہے-اس کی مثالیں ان کے کرداروں کے رویوں سے عیاں ہیں-جیسا کہ قبلہ اور تلمیذ الرحمن وغیرہ قابل ذکر ہیں-

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں فکری جہات میں مزاح کے ساتھ ساتھ تصور غم، سیاسی سماجی موضوعات ہیں تو وہاں پر تصور المیہ کے امکانات بھی دیکھے جاسکتے ہیں-اس حوالے سے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن لکھتے ہیں کہ:

"جب مین نے ۱۹۹۰ء میں دوسری مرتبہ " آب گم" کو پڑھا تو میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ خدا کا شکر کہ " آب گم" کو پڑھنے کے بعد میں پہلے کی طرح یوسفی کو محض ایک مزاح نگار سمجھنے کے گناہ میں مبتلا نہیں رہا-مزاح نگاری کے پردے میں چھپا یوسفی اصل میں ایک المیہ نگار ہے"[۲۷]

مشتاق احمد یوسفی کے کرداروں کا شخصی نفسیاتی تناظر ناسٹل جیا کا اہم محرک ہجرت کے بعد کا منظر نامہ پیش کرتا ہے کہ تقسیم ہند سے مہاجرین کس کرب کا شکار ہوتے ہیں-کس طرح اپنی خودی اور انا کی قربانی دیتے نظر آتے ہیں-ایک نئے ماحول میں انسان کو درپیش مسائل میں انسان ماضی کی یادوں کا سہارا لیتا ہے-حال ماضی سے خراب اور ناقص منظر پیش کرنے لگتا ہے تو انسانی فطرت ہے کہ حال اور ماضی کا موازنہ کرنے لگتا ہے-ان حالات کا اظہار " آب گم" میں یوں ہوتا ہے کہ:

" انسان جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے:
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار---بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے-کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے کھڑے ایک گلاس پانی بھی پیتے تو ہاتھ پر

پانچ دس روپے رکھ دیتے۔ لیکن اب؟ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے---بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے مضافاتی لہجہ میں کہیں "اب کیا ہوئے گا"؟ ہو گا کے بجائے "ہوئے گا" ان کے منہ سے بہت پیارا لگتا تھا۔ اس ایک فقرے میں وہ اپنی ساری سراسیمگی، معصومیت، بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کی بے طلب مدد پر بھروسہ____ سبھی کچھ سمو دیتی تھیں۔ قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور تمکنت سے "دیکھتے ہیں" کہہ کر ان کی تشفی کر دیتے تھے۔"[۲۸]

مشتاق احمد یوسفی کے رویوں میں ناسٹل جیا کا عنصر تقسیم کے بعد کے مہاجرین کو درپیش مسائل کی وجہ سے در آیا۔ یہ ہجرت کا کرب بعد از ہجرت کا جو دکھ جھیل چکے تھے۔ ان تاثرات کی عکاسی کردار "قبلہ" کے ذریعے یوسفی نے حویلی مضمون میں کی ہے۔ اس حوالے سے سید مظہر جمیل اپنی کتاب "آشوب سندھ اور اردو فکشن" میں لکھتے ہیں کہ:

"بے شک وہ عذاب جن سے مرزائے موصوف جیسے لاکھوں افراد اس عہد میں گزر رہے تھے، گھلا دینے والا عذاب ہی تھا۔ یہ صرف زندگی کی آسائشوں سے محرومی کا عذاب نہیں تھا بلکہ قدم قدم پر خودداری کو اپنے ہی ہاتھوں ذبح کرنے، ضمیر کو نیلام چڑھانے اور پل پل منافقت کے دکھ جھیلنے کا عذاب تھا۔ جن سے تارکین وطن کی اکثریت اس تازہ وطن کی فضاؤں میں دوچار تھی۔"[۲۹]

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی معاشرہ مختلف قسم کے اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شکار ہوتا ہے۔ ملک میں فوجی مارشل لاء، غیر یقینی صورت حال، ادیبوں کے لیے زمین تنگ ہوئی۔ سماجی ناہمواریوں پر کھل کر بات کرنا مشکل ترین عمل ٹھہرتا ہے۔ ادیب شاعر اور افسانہ نگار علامتی تجریدی اور تراجم کی صورت میں اپنی سرگرمیاں سرانجام دے رہے تھے۔ پاکستانی معاشرے کے اس عہد میں مشتاق احمد یوسفی نے جو تاثر لیا یہ صرف پاکستانی معاشرے تک محدود نہیں بلکہ آمریت کے دور کے سماجی ناہمواریوں کا نوحہ ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے رویوں میں ماضی انفرادی طور پر نہیں ہے بلکہ اجتماعی طور پر ماضی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایشیائی قوموں میں ماضی کی تکرار اور ماضی کے مضر اثرات کا بیان بھی کرتے ہیں۔ تیسری دنیا میں آمریت اور ماضی کے حوالے سے "آبِ گم" میں لکھتے ہیں کہ:

"لیڈر خود غرض، علما مصلحت بیں، عوام خوف زدہ اور راضی برضائے حاکم، دانش ور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ہو جائیں تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے۔ پھر کوئی طالع آزما آمر ملک کو غصب نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیے: ڈکٹیٹر خود نہیں آتا، لایا اور بلایا جاتا ہے اور جب آ جاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے۔ پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے۔ باہر نکالے

جانے کے بعد کھسیانے بدوایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں--- کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر
ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں-غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے۔"[۴۰]

یادیں انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں-یادوں کے توسط سے انسان بیتے لمحات کو یاد کر کے راحت محسوس کرتا ہے-یاد بنیادی طور پر ناسٹلجیائی کیفیت کی اکائی ہے-یادیں خوشبوؤں کی مانند ہوتی ہیں-ان یادوں کا توازن برقرار رہے تو انسان اور قومیں اس سے مستفید ہو کر آگے بڑھ سکتے ہیں-مشتاق احمد یوسفی ۱۹۵۳ء میں پشاور گیے تھے-تین دہائیوں کے بعد جب جانا ہوا تو یادوں، ملاقاتوں اور باتوں کو اپنے ارد گرد پایا-"شام شعر یاراں" میں لکھتے ہیں کہ:

"ڈپارٹمنٹ آف کلچر، صوبہ خیبر پختونخوا کی دعوت پر تیس برس بعد پشاور جانے کا اتفاق ہوا، تو گئے دنوں کی یادوں نے بے طرح یلغار کی-میں خود بھی حیران رہ گیا-یاد کسی کی، کیسی بھی، کبھی کی ہو، جب آتی ہے تو آتی چلی جاتی ہے-ایسے میں کسی تاریخی تسلسل، منطقی ربط اور اصل موضوع پر تمام تر فوکس کی توقع یا تقاضا، بے وقت و بے سود معلوم ہوتا ہے-فارسی کہاوت ہے کہ آخر چمچے میں وہی کچھ تو آئے گا جو دیگ میں ہے- چھوٹے پیمانے پر ہو تو گرہستنوں کی اصطلاح میں ایسی دیگ باؤلی ہانڈی کہلاتی ہے-پکائی کھیر ہو گیا دلیا بھی کچھ ایسی ہی صورت حال کی تصویر ہے---بنیادی سبب یہ کہ ماضی کی یاد بھوت کی طرح چمٹ جاتی ہے-چھڑائے نہیں چھوٹتی-یہ بھی یاد رہے کہ سنسکرت میں بھوت اور بھوت کال کے معنی گزرا ہوا زمانہ ہیں-یہ بھوت جس پر ایک دفعہ سوار ہو جائے تو وہ حال و مستقبل سے ہمیشہ کے لیے مستغنی بلکہ متنفر ہو جاتا ہے"[۴۱]

ہر عہد کے لوگوں کا اپنا طرز زندگی اور نظام حیات ہوتا ہے جو کہ یہ سب اس عہد کے رہنے والے افراد مل کر اس کو ترتیب دیتے ہیں اور اس کے مطابق زیست بسر کرتے ہیں. یہ افراد کسی معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں. ان لوگوں کی موجودگی اور تعاون سے معاشرے میں رویے فروغ پاتے ہیں. یہ رویے کسی انسان کی شخصیت، فکریات اور نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں. کسی عہد کے نظریات ورجحانات کی عکاسی تحریر میں کرداروں کے ذریعے دیکھنے کو ملتی ہے. مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کے ذریعے عصری رجحانات میں ناسٹلجائی رجحان کو جس زاویے سے دکھایا گیا ہے اس کی مثال آپ ہیں. ناسٹلجائی رجحان کے تناظر میں لکھے گئے فن پاروں میں ماضی پرستی کا پہلو غالب ہوتا ہے. ماضی کے مقابلے میں حال سے لاتعلقی کا احساس قاری متاثر کرتا ہے جب کہ یہی رجحان جب یوسفی جب کرداروں کے ذریعے بیان کرتے ہیں تو انسانی جذبات کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں. کس طرح یہ رجحان شدت اختیار کرتے ہوئے کردار کے رویے میں منفی اثرات کو معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں. "چراغ تلے" کا تلمیذ الرحمن ہو یا پھر حویلی مضمون کا قبلہ، بشارت، جب ماضی سے شدید لگاؤ اختیار کرتے ہیں تو دکھایا جاتا ہے کہ ارد گرد ایسے کرداروں کے بارے میں کن تاثرات کا اظہار کرتے ہیں. دلائل سے ان کرداروں کے رویوں میں ناسٹلجائی

رجحان کے عدم توازن سے پیدا ہونے والے حالات کا تذکرہ ہو چکا ہے. مثال کے طور پر چراغ تلے سے ایک پہلو سامنے رکھتے ہیں.

"بیتی ہوئی گھڑیوں کی آرزو کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹوتھ پیسٹ کو واپس ٹیوب میں گھسانا! لاکھ یہ دنیا ظلمت کدہ سہی لیکن کیا اچھا ہو کہ ہم ماضی کے دھندلے خاکوں میں چیختے چنگھاڑتے رنگ بھرنے کے بجائے حال کو روشن کرنا سیکھیں۔"[۳۲]

مشتاق احمد یوسفی اس طرح کرداروں کے مکالمے کے ذریعے انسانی رویوں کو سامنے رکھنا چاہتے ہیں کہ کس طرح کوئی رجحان منفی سوچ کی عکاسی کرتی ہے. یہ رویے کس طرح شدت پکڑتے ہیں. اس سے قبل ناسٹلجایا کے تحت لکھے گئے فن پاروں میں صرف ماضی کی یادوں کا موضوع زیر بحث آتا تھا جب کہ یہاں یوسفی کرداروں کے ذریعے ماضی کے یاد کو شدت سے یاد کرنے کے اثرات کا پہلو بھی دکھایا گیا ہے کہ ماضی کے برعکس دنیا آج گلوبل گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے، لباس، رہن سہن، تفریح کے ساتھ انداز فکر میں بھی تغیر آشنا ہے. ہر جگہ جدید ٹیکنالوجی سے لوگوں کی ترجیحات میں بدلاؤ آیا ہے. یہ ثقافتی تصادم کا دور ہے. ہم اس کو پسند کریں یا نہ کریں، لیکن ہم اس کی زد میں ہیں. تہذیبی اقدار میں تغیر بدلتے حالات کا تقاضا ہے. عصری رجحانات اور جدید نسل کو مکالمہ اور ہم آہنگی کے ذریعے قائل کیا جا سکتا ہے. ماضی کی یادوں کے ساتھ جوڑ کر خود کو تنہائیوں کا عادی بنایا جا سکتا ہے لیکن لمحہ موجود کے مسائل اور مشکلات سے منہ موڑ کر کنارہ کشی اختیار کرنا کوئی صحت مند رویہ نہیں.

ناسٹلجیا کو یوسفی کی نثر میں فرار کی ایک صورت کے طور پر دیکھا گیا ہے. کرداروں کے رویہ انفرادی ترقی کو روکتا ہے اور افراد کو ماضی میں مست قلندر کی کیفیت میں مبتلا دکھایا ہے. یوں حال کو تسلیم کرنے اور مستقبل کی طرف دیکھنے کے بجائے، ضرورت سے زیادہ ناسٹیلجیا اکثر ایسے وقت کی آرزوؤں کا باعث بنتا ہے جو کبھی دوبارہ نہیں لوٹ سکتا۔ ماضی پر یہ توجہ افراد کو اپنی موجودہ زندگیوں کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے اور نئے تجربات اور مواقع کی تلاش سے روکتا ہے ہے. اس کے علاوہ ناسٹیلجیا ایک آسان اور بہترین ماضی کا محض ایک خواب دکھاتا ہے، اور لمحۂ موجود کی حقیقت کے بارے میں رویے کو مسخ کرتا ہے۔ اکثر اوقات لوگ مخصوص مثبت پہلوؤں کو یاد رکھتے ہیں جب کہ اس وقت کے دوران پیش آنے والے چیلنجوں، تنازعات اور سماجی مسائل کو آسانی سے بھول جاتے ہیں۔ یہ منتخب یادداشت تاریخ کی مسخ شدہ ترسیل کا باعث بن سکتی ہے اور جھوٹی داستانوں کو دوام بخشتی ہے، معاشرتی ترقی اور سچائی کے حصول میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

ناسٹیلجیا غیر ضروری قناعت اور ضروری تبدیلی کے خلاف مزاحمت کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔ ماضی سے چمٹے رہنے سے، افراد ٹیکنالوجی، سماجی اصولوں، اور ثقافتی طریقوں میں ہونے والی ترقی کے خلاف مزاحمت کرنے لگتے ہیں۔ یہ

مزاحمت تحقیقی دریافتوں اور ایجادات کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں. معاشرے کی ارتقاء میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں. اور افراد کو ترقی یافتہ دنیا کے مطابق ڈھالنے سے روکتے ہیں.

یوسفی کرداروں کے رویوں سے یہ تاثر دیتے ہیں کہ

ناسٹلجیا حال کے ساتھ عدم اطمینان کے احساس میں کردار ادا کرتا ہے. اور ادھوری خواہشات کے گھن چکر کو برقرار رکھتا ہے۔ لمحہ موجود یعنی کہ حال کی فہم اور ایک بہتر مستقبل کی تشکیل کے لیے کام کرنے کے بجائے، افراد اپنے موجودہ حالات کا ایک مثالی ماضی سے موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ مسلسل موازنہ ناآسودگی، اداسی، اور حال کے ساتھ سمجھوتہ میں کمی کا باعث بنتا ہے. آخر میں، ضرورت سے زیادہ ناسٹلجیا جذباتی انحصار پیدا کرنے لگتا ہے اور تغیر و تبدیلی اور نقصان سے نمٹنے کے لیے افراد کی صلاحیت کو روکتا ہے۔ جب افراد جذباتی سہارے اور استحکام کے لیے ماضی کی یادوں پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں، تو وہ زندگی کی مشکل منازل سے گزرتے ہوئے مشکلات کا شکار ہوتے ہیں. یوں ناسٹلجائی رجحان ایک منفی رویوں کا سبب بنتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کو ناقدین ناسٹل جیک قرار دیتے ہیں. اس کے دلیل میں "آب گم" کے پیش لفظ میں یوسفی کے ہی اقتباس پیش کرتے ہیں جو کہ یوسفی نے "آب گم' کے کرداروں کے متعلق بتایا تھا. حالانکہ یوسفی اسی پیش لفظ میں ایشیا کے ملکوں کا ولن ماضی پرستی کو قرار دے رہے ہیں. لیکن ناقدین عجلت میں یہی لبل چسپاں کرنا مناسب سمجھتے ہیں. گو کہ یوسفی کی نثر میں باریکی سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے یوسفی جب ماضی کو یاد کرتے ہیں تو وہ محض ماضی پرستی نہیں ہوتی بلکہ ماضی کے حوالے سے وہ ان تہذیبی اقدار کی پامالی کا اظہار کرتے ہیں جنہیں تقسیم پاکستان کے بعد ختم کر دیا ہے. تقسیم پاکستان ۱۹۴۷ کے بعد کے مہاجرین کے حالات کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک خواب کی تعبیر لے کر سرحد پار سے لوگ ہجرت کرتے ہیں اور یہاں عزت کی دو وقت کی روٹی کے لیے ترستے ہیں. یہ صرف مضمون کے کردار "قبلہ" کو المیہ نہیں ہے. جب کہ مہاجرین کے مسائل کی عکاسی ہے. ناسٹلجیا کا شکار آدمی تب ہوتا ہے جب حال کے مقابلے میں ماضی بہترین اور پرکشش دکھائی دینے لگے. یعنی کہ حال کی مایوسی انسان کو ماضی میں لے کر جاتی ہے. ایسی صورت حال میں "قبلہ" کی بے بسی یوں سامنے آتی ہے.

> "اس حویلی کا فوٹو ہم سبھی نے بار بار دکھایا. اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کیمرے کو موتیا نظر آنے لگا ہے. لیکن کیمرے کے ضعیف بصارت کو قبلہ زور بیان سے دور کر دیتے تھے. یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے. گزرا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے. آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔" [۳۳]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر کردار ماضی کو تب یاد کرتے ہیں جب حال میں مایوسی اور ناقدری کا سامنا کرنا پڑتا ہے. یہ ماضی کی کسک ناسٹلجیا کے مثبت جذبات کو جنم دیتے ہیں. اور مشکل حالات میں سکون کا سبب بنتے ہیں۔ ماضی کے مشاہدات

و تجربات، پر نظر ثانی کرنا اور خوشگوار لمحات کو زندہ کرنا مزاج کو بہتر بنانے میں موثر ہوتا ہے یہ تناؤ کو کم کرتا ہے، اور مجموعی طور پر ماحول کو سازگار بناتے ہیں. ناسٹیلجیا انسان کو ایک جذباتی سہارے کے طور پر مضبوط کرتا ہے. یہی وجہ ہے کہ کردار " قبلہ " خود کو خوشگوار یادوں سے جوڑے رکھتا ہے، خوشی اور اطمینان کے احساس کو محسوس کرتا ہے.

ناسٹیلجیا ہماری انفرادی اور اجتماعی شناخت کی تشکیل میں اہمیت کا حامل ہے۔ اپنے ماضی پر نظر ثانی کرنے سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہماری بقا کس میں ہے؟ ہمارے بزرگ جو ہجرت کر کے آئیں ہیں. اس کے بدلے ہمارے بزرگوں کو شان و شوکت کی رہائش تو ملنی چاہیے. وہ مراعات جو کہ قبل از ہجرت ہمیں میسر تھے وہ تو ملنے چاہیں۔ "قبلہ " ان سوچوں میں پرانی یادوں تک دوبارہ رسائی کو مکمل بنانے کی کوشش کرتا ہے. ناسٹیلجیا میں عموماً دوسروں کے ساتھ مشترکہ یادیں اور تجربات شامل ہوتے ہیں، جو سماجی تعلق کو مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ماضی کے واقعات کو یاد کرنا دوست واحباب اور خاندان کے ساتھ یاد دلانا آپس میں ہمدردی اور اتحاد کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ناسٹیلجیا دوطرفہ تعلقات کے دھاگے کے طور پر کام کرتا ہے جو لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے، تعلقات کو مضبوط کرتا ہے اور تعلق کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔

ناسٹیلجیا تحریک اور ترغیب کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ماضی کی کامیابیوں، سرخروئی کے لمحات، یا دلکش یادوں پر غور کرنا ہمارے اہداف کو حاصل کرنے میں جذبہ اور حوصلہ افزائی کر سکتا ہے۔ ناسٹیلجیا ہمیں ثقافتی ورثے اور روایات کو محفوظ رکھنے اور ان کو فرروغ دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ ماضی کے ثقافتی نمونے، موسیقی، ادب، یا آرٹ پر نظر ڈال کر، ہم اپنی جڑوں سے تعلق برقرار رکھ سکتے ہیں اور ثقافتی طریقوں کے تسلسل کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ ناسٹیلجیا ہماری ثقافتی تاریخ کی فراوانی اور تنوع کی حوصلہ افزائی کرنے، ثقافت پر فخر اور اجتماعی شناخت کے احساس کو فروغ دینے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ ماضی کے تجربات کا جائزہ لے کر، ہم اپنی غلطیوں سے سیکھ سکتے ہیں، ذاتی ترقی کے بارے میں بصیرت حاصل کر سکتے ہیں، اور اپنی زندگیوں میں مثبت تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ ناسٹیلجیا خود کو جانچنے، پرکھنے کا موقع مہیا کرتا ہے، ہمیں ماضی کے تجربات پر استوار کرنے اور ذاتی ترقی کے لیے کوشش کرنے کے قابل بناتا ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ناسٹیلجیا مثبت اثرات کا حامل ہو سکتا ہے لیکن اعتدال پسندی شرط ہے۔ ماضی میں ضرورت سے زیادہ کھو جانا ترقی میں رکاوٹ بننے کا امکان ہوتا ہے. اس کے ساتھ ساتھ افراد کو حال اور مستقبل سے مکمل طور پر قبول کرنے سے روکنے کا سبب بن سکتا ہے. حال میں ایک مثبت سوچ اور خیالات ناسٹیلجیا کو متوازن رکھنے سے ہمیں ماضی کی قدر کرنے اور اس سے سیکھنے میں مدد مل سکتی ہے اور ہم لمحہ موجود میں اپنی زندگیوں کو فعال طور پر تشکیل دے سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا باب میں مشتاق احمد یوسفی کے رویوں میں ناسٹلجیائی عناصر: شخصی نفسیاتی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی کوشش کی گی ہے۔ یوسفی کے کرداروں کا شخصی و نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ناسٹلجیائی رجحان کی نشاندہی کرتے ہوئے یوسفی کی نثر سے اقتباسات اور ناقدین کی آرا کی روشنی میں راقم نے تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ آنے والے باب میں مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا: مثبت قوت یا انفعال؟ پیش کیا آئے گا۔

حوالہ جات

۱۔ Www.dictionary. Cambridge. Org(مورخہ:۲۰/جون۲۰۲۳ء:بوقت ۵:۲۲دن)

۲۔ Www.dictionaryenglih to urdu. Com(مورخہ:۲۰/جون۲۰۲۳ء:بوقت ۵:۳۰دن)

۳۔ Www.medicaldictionary.com(مورخہ:۲۰/جون۲۰۲۳ء:بوقت۵:۴۸دن)

۴۔ جاوید، قاضی،ناسٹل جیا کے بارے میں چند باتیں(مشمولہ ماہ نو،مدیر مظفر عباس۔ کراچی: اکتوبر ۱۹۸۰ء)ص نمبر ۲۲

۵۔ سہیل،سید عامر۔قرۃ العین حیدر:خصوصی مطالعہ(ملتان:بیکن بکس،۲۰۱۳ء)ص ۵۱۲

۶۔ پرویز،اسلم۔ ناسٹل جیا:لالا جسونت کی حویلی (مشمولہ جانکی بائی کی عرضی،مصنف حامد مرزا بیگ، اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)ص ۳۳۔

۷۔ بٹ،عاصم۔ عبداللہ حسین: شخصیت اورفن(اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء) ص۵۸

۸۔ سہیل،احمد۔اردو افسانے کا ناسٹلجیا(ملتان:تدوین پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)ص ۳۲۔۳۳

۹۔ یوسفی،مشتاق احمد۔خاکم بدہن(کراچی:دانیال پبلشر،۲۰۰۰ء)ص۱۷۔

۱۰۔ ایضاً،ص۱۸۔۱۹

۱۱۔ ایضاً،ص ۲۳۔۲۴

۱۲۔ ایضاً،ص ۳۴۔۳۵

۱۳۔ ایضاً،ص ۳۷۔

۱۴۔ یوسفی،مشتاق احمد۔زرگزشت(کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۸ء)ص۶۹۔۷۰۔

۱۵۔ ایضاً،ص۱۵۸۔

۱۶۔ ایضاً،ص ۲۵۔

۱۷۔ ایضاً،ص ۱۳۴۔

۱۸۔ یوسفی،مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس،س۔ن)ص ۴۳۔

۱۹۔ ایضاً،ص ۴۶۔۶۵۔

۲۰۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر۔رفتہ و آئندہ(اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۸ء)ص ۲۲۱۔

۲۱۔ یوسفی، مشتاق احمد۔زرگزشت(کراچی:مکتبہ دانیال، ۲۰۱۸ء)ص نمبر ۱۰۔
۲۲۔ یوسفی، مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس، س۔ن)ص ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔ ۱۸۵۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۷۷۔ ۱۸۰۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۱۹۱۔
۲۶۔ یوسفی، مشتاق احمد۔چراغ تلے(کراچی:مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء)ص ۵۸
۲۷۔ عزیزابن الحسن، ڈاکٹر۔یوسفی کا مزاح اور ان المیہ شعور(مشمولہ معیار شمارہ ۲۰، مدیر عزیز ابن الحسن۔اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی ۲۰۱۸ء)ص ۲۳۷۔ ۲۳۸۔
۲۸۔ یوسفی، مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس، س۔ن)ص ۴۴۔
۲۹۔ مظہر جمیل، سید۔آشوب سندھ اور اردو فکشن(کراچی:اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء)ص ۱۴۷
۳۰۔ یوسفی، مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس، س۔ن)ص ۱۳۔
۳۱۔ یوسفی، مشتاق احمد۔شام شعر یاراں(لاہور:جہانگیر بکس، س۔ن)ص ۳۶۹۔ ۳۷۰۔
۳۲۔ یوسفی، مشتاق احمد۔چراغ تلے(کراچی:مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء)ص ۶۴۔
۳۳۔ یوسفی، مشتاق احمد۔آب گم(لاہور:جہانگیر بکس، س۔ن)ص ۷۴۔

باب چہارم:

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا:

مثبت قوت یا انفعال؟

باب چہارم

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا: مثبت قوت یا انفعال؟

ادب خلا میں جنم نہیں لیتا اور نہ ہی ادیب بند کمرے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ادیب کا عصری تقاضوں اور رجحانات سے مثبت یا منفی اثرات قبول کرنا فطری عمل ہے۔ یہ اثرات آکسیجن کی مانند ادیب کے تخلیقی وجود کے لئے ضروری ہیں۔ یہ عمومی رجحانات، میلانات اور عصری تقاضے غیر مرئی روپ میں ادیب کے فکری رویوں اور کرداری سانچوں میں ان کے سراغ تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ ادیب کی تحریر اور کرداروں میں عصری رجحانات اور فکریات کے اثرات مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ کسی ادبی رجحان کی تشکیل اور تخلیقی تجربے کے پس منظر میں سیاسی، سماجی اور معاشی محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان محرکات اور اسباب کا مطالعہ تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

عہد حاضر میں ناسٹل جیا بطور رجحان کی حیثیت اختیار کررہا ہے۔ مختلف زبانوں کے ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں۔ عالمی ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کو اہم مقام حاصل ہے۔ بیسویں صدی کے واقعات اور تغیرات سے انسان سوچنے پر مجبور ہوگیا ہے کہ ماضی اس کے لمحہ موجود یعنی حال سے قدرے بہتر تھا۔ بیسویں صدی کے دو عظیم جنگیں، بعد از جنگ کے اثرات، تقسیم ہند، ۱۹۶۵ء جنگ، سقوط ڈھاکہ، سقوط سویت یونین اور نائن الیون یہ ایسے اجتماعی واقعات ہیں جس نے عالمی اور مقامی سطح پر انسان کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کردیا۔ ان سیاسی سماجی تبدیلیوں سے انسان جسمانی و ذہنی طور پر براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ یہ صورتحال ناسٹل جیا کے رجحان کو جنم دینے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ عالمی سطح پر اور مقامی سطح پر ایسا ادب تخلیق ہونے لگتا ہے کہ جس میں ماضی خوبصورت ترین احساس کے ساتھ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

اردو ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کے ابتدائی نقوش اولین عہد میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پرآشوب دور میں اردو زبان وادب نے فروغ پایا۔ مختلف حملہ آوروں اور سامراجی طاقتوں کے زیر اثر انسانی رویوں کو فروغ ملتی ہے۔ اردو ادب کے شعراء، ناول نگار اور افسانہ نگار اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا نوحہ اپنی تخلیقات میں بیان کرتے آرہے ہیں۔ میر، درد، غالب، بہادر شاہ ظفر، مرزا ہادی رسوا، ناصر کاظمی، انتظار حسین، خدیجہ مستور، انور سجاد اور عبداللہ حسین جیسے اردو کے رجحان ساز لکھاریوں کے ہاں ناسٹلجیائی رجحان کے عناصر کثرت سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

ناسٹلجیا بنیادی طور پر نفسیات کی اصطلاح ہے۔ یہ یونانی زبان کے دو الفاظ سے بنتا ہے۔ nostos لغوی معنی واپس گھر کی طرف لوٹنا اور algos کے معنی ہے کرب، درد۔ ناسٹلجیا کی اصطلاح پہلی مرتبہ جوہانسس ہوفر نے استعمال

گیا۔ ناسٹلجیا کو شروع شروع میں نفسیاتی بیماری کے معنوں میں لیا گیا۔ ادب کا موضوع انسان ہے۔ ناسٹلجیا انسان سے وابستہ واقعات، تجربات اور مشاہدات کا تجزیہ بیان کرتی ہے۔ ناسٹلجیا ایک ایسا احساس ہے جو کہ ہر انسان کسی نہ کسی صورت میں محسوس کرتا ہے۔ ماضی ہر انسان کا ہوتا ہے۔ یادیں ہر امیر اور غریب کی ہوتی ہیں۔ انسانی جذبات اور احساسات کا بیان ماضی کی یاد کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔ اپنوں کی دوری، ہجرت، مالی تنگی، حال کی تلخی اور کئی ایسے دیگر عوامل کی وجہ سے ناسٹلجیا کے احساس کو فروغ ملتا ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد ہمارا گزرا ہوا زمانہ۔ ماضی انسان کی یادوں میں کسی نہ کسی صورت زندہ رہتا ہے۔ اس حوالے سے ممتاز احمد لکھتے ہیں کہ:

> "ناسٹلجیا ایک مثبت طرز احساس ہے۔۔۔۔ناسٹلجیا یادیں کبھی جدا نہیں ہو سکتیں۔ کیوں کہ یہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔۔۔۔یہ سوال کہ یہ مریضانہ اور منفی جذبہ تو نہیں تو اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ایسا قطعی نہیں۔"[1]

انسان اور وقت دونوں میں مماثلت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ چلے جائیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے۔ دونوں کا تعلق مسافر خانے کی مٹی سے بنا ہے۔ یہ دونوں اپنے پیچھے صرف یادیں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ اسلئے یاد ہی انسانی زندگی کی اکائی ہے۔ امیر، غریب، عالم یا عام انسان یادیں ہر انسان کے لیے انمول خزانہ ہیں۔ یادیں خود پر بیتا ہوا وقت اور دیکھے گئے مناظر ہیں تب ہی تو یہ انسان کے ماضی کے عین گواہ ہیں۔ ناسٹلجیائی کیفیت میں انسان یادوں کے سہارے ایک عہد کی انفرادی اور اجتماعی تجربات کو یاد کرتا ہے۔ اس بارے میں قاضی جاوید لکھتے ہیں کہ:

> "بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورتحال کی ناگواری کا مداوا کر سکتے۔"[2]

اپنی کل پر نظر ڈالی جائے تو ایک سادگی تھی، محبت تھی اور کشادہ دلی تھی۔ وہی سہانے دن تھے جب گھر کے کھلے صحن یا چھت پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے شام کو چارپائیوں بچھاتے، زیادہ سے زیادہ ایک پنکھا لگتا- سبھی سکون سے سوتے صبح بالکل تازہ اٹھتے۔ چاند ستاروں سے روشن کھلا آسمان دیکھتے لیکن موجودہ عھد کو دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ ہم نے خود کو کچن کے خالی ڈبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ انسانی رشتوں میں دوریاں ہیں۔ زندگی الجھ سی گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ انسانی اقدار اور انسانی رویے تیز رفتاری سے بدل گئے ہیں۔ شاید بدلتے وقت کا تقاضا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لئے اس حقیقت کو قبول کرنا مشکل بھی ہوتا ہے۔ ماضی تقریباً ہر انسان کی یادوں میں کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہتا ہے۔ کبھی خوش گوار تو کبھی دل کو بوجھل کرنے والا لیکن انسان کے فکری ارتقاء کا سفر جاری ہے۔ انسان کی بقاء ہی بدلتے وقت اور رجحانات کے ساتھ ہم آہنگی اور توازن قائم کرنا ہے۔ زمانے تین

صورتوں پر مبنی ہے ماضی، حال اور مستقبل۔ان میں توازن برقرار رکھنا ہی انسانی زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے۔انتظار حسین لکھتے ہیں کہ:

> " حافظہ نہ ہو تو ماضی کا عرفان کیا اور ماضی کا عرفان نہ ہو تو حال و مستقبل کی حدبندی ہی کیا۔یہ عمل ظاہر ہے محض ایک غیر محدود، بے نام و نشاں سے حال میں زیست کرنے سے جاری ہو سکتا ہے نہ حاصل۔"[۳]

ناسٹلجیا کے بنیادی نظریات نفسیات سے لیے گئے ہیں۔اردو ادب میں ناسٹلجیا کا رجحان نیا ہرگز ہیں بلکہ اکثر و بیشتر تحریروں کا موضوع خواہ کوئی بھی ہوں ان میں ناسٹلجیائی عناصر کی کارفرمائی واضح نظر آتی ہے۔ناسٹلجیائی رجحان کو زیر بحث لاتے ہوئے صرف منفی پہلوؤں کو اجاگر کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک مثبت رجحان کے طور پر اپنی پہچان رکھتا ہے۔ظاہر ہے کہ ابتدائی صورت میں نفسیاتی بیماری اور بیماری کے علاج کے معنوں میں لیا گیا۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت اور فکری پہلوؤں میں اضافہ ہوتا گیا۔نقل مکانی کرنے والوں اور جنگ میں اپنے پیاروں سے بچھڑنے والوں کی یاد میں ایک مشہور پہلو ہے۔ناسٹلجیا انسانی زندگی کا ایک باطنی جز ہے۔ناسٹلجیا ان بجھا ہوا شعلہ ہے جو یادوں کو ہلکی سی انچ پر رکھ کر انسان کو ماضی کی یادوں میں لے جاتا ہے۔ایک خوشگوار احساس مسرت کا سبب بنتا ہے۔یہ انسانی وجود کا بنیادی سرچشمہ ہے۔جیسا کہ تصویر کے دورخ ہوتے ہیں ایسا ہی کسی رجحان کے بھی دورخ ہوتے ہیں۔مثبت اور نفی اثرات میں جب توازن بگڑتا ہے تو ذہنی، روحانی، جسمانی اور وجودی لحاظ سے تصادم کی فضا فروغ لیتی ہے۔احمد سہیل ناسٹلجیا کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> "ناسٹلجیا کا مفہوم ہمارے یہاں" خانہ اداسی "سے لیا جاتا ہے جو یکسر غلط ہے۔خانہ اداسی سے مراد Homesickness ہے۔یہ کہ ناسٹلجیا جو بظاہر (لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے) حقیقتاً دو یونانی لفظ notos بمعنی" واپسی "اور algos جس کے معنی" درد "کے ہیں۔۔۔۔۔۔سے مل کر بنا ہے۔لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی "دردآلود واپسی" ہو گا۔"[۴]

ناسٹلجیا انسان کی شخصیت پر شدت سے حاوی ہو جائے تو انسان کے لیے رکاوٹوں اور مسائل کا سبب بنتا ہے۔ناسٹلجیا میں یادوں کی ہلکی سی آنچ پر ایک بڑی تہذیب، اقدار، روایات، رہن سہن اور طور طریقوں کو یاد کیا جا سکتا ہے۔اخلاقی اقدار اور روایات کی موجودہ عہد کے ساتھ موازنہ کرکے حال کو خوب سے خوب تر کیا جا سکتا ہے۔ناسٹلجیا کے اثرات جب کسی قوم یا فرد پر حاوی ہوتے ہیں تو اس کے کچھ عوامل، محرکات اور اسباب ہوتے ہیں۔جس کی بنیاد پر فرد اور قوم عدم تحفظ اور شکایت کا اظہار کرتی ہے۔کہ لمحہ موجود سے ماضی اچھا تھا۔حال کی تلخی، حال کی ناقدری، اقدار کی پامالی، جدید عصر کی رویوں سے عدم توازن اور جدید نسل سے دوری اختیار کرکے خود کو خود ساختہ یادوں تک محدود کرنا ناسٹلجیا کے تخریبی پہلوؤں کی جانب اشارہ ہے۔ماضی کی تڑپ کوئی برائی نہیں لیکن یہ

بھی متوازن رویے کی عکاسی نہیں ہے کہ لمحہ موجود کو یکسر نظر انداز کیا جائے۔اس طرح لوگوں کی موجودگی میں مذکورہ فرد خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔اگر یہ فرد کوئی تخلیق کرتا ہے تو اس میں ان رویوں کے عناصر کی موجودگی دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی ہے۔ایسے میں پڑھنے والے لوگ ماضی پرست، رجعت پسند اور ناسٹلجیک جیسے القابات سے نوازتے ہیں۔عاصم بٹ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"ناسٹلجیا خود کو دہرانے کی خواہش کا نام ہے۔ناسٹلجیا سے مراد اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ماضی سے مراد اپنا وہ سب کچھ جو ہو چکا ہے اور وہ سب کچھ جو پہلے سمجھا۔اس کی طرف لوٹنے کی خواہش ناسٹلجیا ہے۔"[۵]

ناسٹلجیا کے عناصر زیادہ تر تین حالتوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔زمانی ناسٹلجیا، زمینی ناسٹلجیا اور شخصی ناسٹلجیا۔زمانی ناسٹلجیا جیسا کہ نام سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ گزرے ہوئے دور اور زمانے کو یاد کرنا۔زمینی ناسٹلجیا میں آدمی کسی علاقے اور جگہ سے رومانس اور یادوں کے سحر میں رہتا ہے۔ایک ایسا علاقہ جس میں آدمی کا بچپن، جوانی اور زندگی کا اہم ترین وقت گزرا ہو۔تیسری حالت جو کہ شخصی انفرادی ہے جو کہ انفرادی نوعیت کا ہے کہ آدمی خود سے وابستہ چیزوں، علاقہ، دوستوں اور اچھے وقت کو یاد کرتا ہے۔دیکھا جائے تو یہی تین حالتیں مشتاق احمد یوسفی کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔"آب گم" کا کردار "بشارت" جب کانپور سے کراچی رہائش اختیار کرتا ہے تو ان تینوں کیفیات کا شکار دکھائی دیتا ہے۔خصوصاً اپنی بیگم کی وفات کے بعد اور بڑھتی عمر سے تنہائی کا شکار ہو کر ماضی کی یادوں میں چلا جاتا ہے۔اس کی عکاسی "آب گم" کے مضمون شہر دو قصہ میں یوں ہوتی ہے کہ:

" کم و بیش پینتالیس برس کا ساتھ تھا۔نصف صدی ہی کہیے۔بیوی کے انتقال کے بعد بشارت بہت دن کھوئے کھوئے سے، گم صم رہے۔جیسے انھوں نے کچھ گم نہ کیا ہو، خود گم ہو گئے ہوں۔جوان بیٹوں نے میت لحد میں اتاری، اس وقت بھی وہ صبر وضبط کی تصویر بنے، تازہ کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر خاموش کھڑے دیکھا کیے۔ابھی ان کے بٹوے میں مرحومہ کے ہاتھ کی رکھی ہوئی الائچیاں باقی تھیں۔۔۔۔اچانک ایسا سانحہ ہو جائے تو کچھ عرصے تک تو یقین ہی نہیں آتا کہ زندگی بھر کا ساتھی یوں آناً فاناً بچھڑ سکتا ہے۔نہیں۔اگر وہ سب کچھ خواب تھا تو پھر یہ بھی خواب ہی ہو گا۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی یہیں کسی دروازے سے مسکراتی ہوئی آنکلے گی۔رات کے سناٹے میں کبھی کبھی تو مانوس آہٹ اور چوڑیوں کی کھنک تک صاف سنائی دیتی اور وہ چونک پڑتے کہ کہیں آنکھ تو نہیں جھپک گئی تھی۔۔۔۔پھر اچانک واشگاف لمحہ آیا کہ یکلخت یقین آگیا۔پھر سارے پندار پشتے اور سارے آنسو بند اور تمام صبر فصیلیں ایک ساتھ ڈھے گئیں۔وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دئے۔"[۶]

ناسٹلجیائی رجحان کو مشتاق احمد یوسفی نفسیاتی حوالے سے واضح کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کردار جو ہجرت کے سبب یادِ ماضی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ جب واپس آبائی علاقے میں جاتے ہیں جس کو یہ یاد کر کے راحت محسوس کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے بعد جب وہ جاتے ہیں تو حال کے بجائے پچاس سالہ پرانے عہد سے موجودہ کانپور کا موازنہ کرتے ہیں۔ ان حالات کا اظہار یوسفی کرداروں کے ذریعے بیان کرتے ہیں کہ:

"ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔ پاکستان سے جو بھی آتا ہے، ہوائی جہاز سے اترتے ہی اپنا فارن ایکسچینج اچھالتا ہے، یہی رونا روتا ہوا آتا ہے۔ جسے دیکھو، آنکھوں میں آنسو بھرے شہر آشوب پڑھتا چلا آرہا ہے۔ ارے صاحب! ہم نصف صدی سے پہلے کا کانپور کہاں سے لا کے دیں۔ بس جو کوئی بھی آتا ہے، پہلے تو ہر موجود چیز کا موازنہ پچاس برس پہلے کے ہندوستان سے کرتا ہے۔ جب یہ کر چکتا ہے تو آج کے ہندوستان کا موازنہ آج کے پاکستان سے کرتا ہے۔ دونوں مقابلوں میں چابک دوسرے گھوڑے کے مارتا ہے، جتواتا ہے اپنے ہی گھوڑے کو"[ے]

زمانہ تغیر کی زد میں ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ انسان کے ارد گرد کا ماحول بدلتا ہے۔ ہجرت کے بعد آدمی جب اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ یہ ماضی کی تڑپ انسان کو حال سے بیگانہ کر دیتی ہے لیکن اگر آدمی کو ماضی کو یاد کرنے والے علاقے جانے کا موقع ملتا ہے تو وہاں بھی حالات وقت کے بدلنے سے تبدیلیاں رونما ہو چکی ہوتی ہیں تو ایسے میں وہ خود تو حقیقت سمجھ جاتا ہے لیکن بضد ہوتا ہے کہ ماضی موجودہ عہد سے بہترین ہے۔ ماضی ایک قید خانے یا بھوت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کی وضاحت "چراغ تلے" کے مضمون "یادش بخیریا" میں یوں ہوتا ہے کہ:

"جب ان کے یادش بخیریا نے شدت اختیار کی تو دوستوں میں یہ صلاح ٹھیری کہ ان کو دو تین مہینے کے لیے اسی گاؤں میں بھیج دیا جائے جس کی زمین ان کو حافظے کی خرابی کے سبب چہارم آسمان دکھائی دیتی ہے۔۔۔ انھیں اس بات سے رنج پہنچا کہ جہاں پہلے ایک جوہڑ تھا جس میں دن بھر بھینسیں اور ان کے مالکوں کے بچے پڑے رہتے تھے، وہاں اب ایک پرائمری اسکول کھڑا تھا۔ اس میں انھیں صریحاً چاکسو کلاں والوں کی شرارت معلوم ہوتی تھی۔۔۔ ان جیسے حساس آدمی کے لیے یہ بڑے دکھ اور اچھنبے کی بات تھی کہ وہاں مارچ میں اب بھی پھول کھلتے ہیں اور گلاب سرخ اور سبزہ ہرا ہوتا ہے۔ دراصل ایک مثالی اولڈ وائے کی طرح وہ اس وقت تک اس صحت مند غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ساری چونچالی اور تمام خوش دلی اور خوش باشی ان کی نسل پر ختم ہو گئی۔"[۸]

انسان کی تصوراتی دنیا کس قدر خوب صورت ہوتی ہے۔ ماضی ایک حسین ترین قید خانہ ہوتا ہے۔ تخیل کے زور پر انسان ماضی اور یادوں کے سحر میں مبتلا ہو کر حال کے ہر قسم کی آسائش اور سہولیات سے منہ موڑتا ہے۔ تخیل خوب صورت ہوتا ہے۔ ایک فینٹسی کی سی کیفیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ انسان امکان اور گمان کے مابین زندگی بسر کرتا

ہے۔ماضی کو یاد کرتے کرتے جب انسان ماضی کی طرف یقینی طور پر جاتا ہے تو ایک آس، تو تخیل کا حقیقت سے جب سامنا ہوتا ہے تو انسان کو اپنے گزرے ہوئے اس عہد پر دکھ ہوتا ہے۔احساس رائیگانی سی ہوتی ہے۔جس میں تخیل کے ماضی کو یاد کرتا ہے۔حقیقت میں ماضی کا تخیل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔یہاں پر کردار اپنے ماضی کو یاد کرنے کے وقت پر افسوس کرتا دکھائی دیتا ہے۔یہاں پر یوسفی کردار کے نفسیاتی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں کہ ماضی پرستی انسان کو بند گلی میں لا کر چھوڑ دیتی ہے۔یوں ماضی کا یہ تاریک پہلو بشارت کے ذریعے یوں دکھاتے ہیں کہ:

"سو اس طفل بزرگ نے کانپور جا کر بہت گریہ کیا۔پینتیس برس تک تو اس پر رویا کیے کہ ہائے! ایسی جنت چھوڑ کر کراچی کیوں آ گئے۔اب اس پر روئے کہ لاحول ولا قوۃ! اس سے پہلے ہی چھوڑ کر کیوں نہ آ گئے۔خواہ مخواہ عمر عزیز کی ایک تہائی صدی غلط بات پر رونے میں گنوا دی۔رونا ہی ضروری تھا تو اس کے لیے ۳۶۵ معقول وجوہات موجود تھیں، اس لیے کہ سال میں اتنی ہی مایوسیاں ہوتی ہیں۔اپنی "ڈریم لینڈ" کا چپہ چپہ چھان مارا، لیکن وہ لہر نہ پھر دل میں جاگی، وہ رنگ نہ لوٹ کے پھر آیا۔"[۵]

خیالات کی نوعیت کا حقیقت کی دنیا سے دور کا تعلق نہیں ہوتا۔انسان خیالات کے سبب تصوراتی دنیا میں سفر کرتا ہے تو ایک احساس راحت محسوس کرتا ہے - مجرد خیالات کا جب حقیقت سے سامنا ہوتا ہے تو سوائے ندامت اور احساس رائیگانی کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔خیالات کی دنیا خواب کی کیفیت کی مانند ہوتی ہے-خوابوں کے سراب میں انسان جس قدر کھویا رہتا ہے تب تک سب اچھا ہے کی بنیاد پر چل رہا ہوتا ہے لیکن جب خیالات اور طلسم کا اثر جب ٹوٹتا ہے تو ایک زوردار جواب ملتا ہے کہ جس سے انسان کی روح میں ایک درد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی کہ انسان کو خیالات کی دنیا میں حقیقی طور پر جب سامنا کرنا پڑ جائے تو انسان کو ایک خواب غفلت سے بیداری کا احساس ہونے لگتا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ خیالات کی دنیا یعنی کہ طلسماتی دنیا میں رہتے ہوئے ایک فرضی خوش گوار احساس تو تھا جو کہ اب وہ بھی نہیں رہا۔مشتاق احمد یوسفی ان رویوں کو خوب صورت پیرائے میں "شہر دو قصہ" میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"جب دفعتاً اس کا جی بچپن کی دنیا کی ایک جھلک_ آخری جھلک_ دیکھنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔لیکن اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کوئی غیبی ہاتھ چپکے سے سوئی طاقت کا) magnifier محدب شیشہ) رکھ دیتا ہے۔دانا کبھی اس شیشے کو ہٹا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔اس کے ہٹتے ہی ہر چیز خود اپنا)miniature تصغیر) معلوم ہونے لگتی ہے۔اگر آدمی اپنے بچپن کے)locale جائے ورود وارادات) سے عرصہ دراز تک دور رہا ہے تو اسے ایک نظر آخری بار دیکھنے کے لیے ہرگز نہیں جانا چاہیے۔لیکن وہ جاتا ہے۔وہ منظر اسے ایک طلسمی مقناطیس کی مانند کھینچتا ہے اور وہ کھنچا چلا جاتا ہے۔اسے کیا معلوم کہ طفل طلسمات پر جہاں دیدہ

آنکھ پڑ جائے تو سارے طلسم ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہروپ نگر کی ساری پریاں اڑ جاتی ہیں اور شیش محل پر کالک پت جاتی ہے۔ اور اس جگہ تو اب مقدس خوشبوؤں کا دھواں ہی دھواں ہے۔ یہاں جو کام دیو کی دہکتی دھنک کمان ہوا کرتی تھی وہ کیا ہوئی؟" [۱۰]

ماضی انسان کی یادوں میں زندہ رہتا ہے۔ یہ کبھی خوشگوار احساس کے طور پر تو کبھی دل کو بوجھل کرنے والا! وقت اور حالات بدلنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اس بدلتے ماحول میں انسان جسمانی و ذہنی طور پر بھی بدلتا ہے۔ انسانی سوچ اور شکل صورت میں تبدیلی فطرت کے مطابق ہے۔ انسان ایک عرصہ جب ایک ماحول سے دور ہوتا ہے تو ایک طویل عرصے کے بعد گزرے عہد کے لوگوں سے جب ملاقات ہوتی ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ان کے چہرے پر تبدیلی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ہوتی رہتی ہے تو ایسے میں احمد مشتاق اس حوالے سے کہتے ہیں کہ:

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں حسیں رہتا ہے

یعنی کہ بدلتے وقت کے ساتھ عصری تبدیلی حالات کے مطابق عین ممکن ہے۔ قدرت کا یہی اصول ہے لیکن ماضی کی تڑپ جب انسان کے جذبات میں شدت اختیار کرتی ہے تو انسان اپنے عہد کا موازنہ زبان، لہجہ، ملبوسات اور شہر کے ترجیحات وغیرہ سے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان کی بول چال اور لہجے وغیرہ میں جو تبدیلی آتی ہے جدید زبانوں کے الفاظ کا اردو میں آنا، اس کا پرانے عہد کی زبان سے موازنہ ناسٹلجیا کا بشارت شکار ہوتا ہے۔ اس کی عکاسی یوں دیکھنے کو ملتی ہے:

"کہنے کو تو آج بھی اردو بولنے والے اردو ہی بولتے ہیں۔ مگر میں نے ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ عام آدمی کا ذکر نہیں، اردو کے پروفیسروں اور لکھنے والوں تک کا وہ لہجہ نہیں رہا جو ہم آپ چھوڑ کے آئے تھے۔ کراراپن، کھراپن، وہ کڑی کمان والا کھٹکا جاتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے ڈھلک کر ہندی کے پنڈتائی لہجے کے قریب آ گیا singsong لہجہ۔ you know what i mean یقین نہ آئے تو آل انڈیا ریڈیو کی اردو خبروں کے لیجے کا کراچی ریڈیو یا میرے لہجے سے موازنہ کر لیجیے۔۔۔ "اور تمہاری زبان اور لب و لہجے پر جو پنجاب کی چھاپ ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتی، ہمیں آتی ہے! تمہیں یاد ہو گا، ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو جب میں تمہیں ٹرین پر سی آف کرنے گیا تو تم سیاہ رام پوری ٹوپی، سفید چوڑی دار پاجامہ اور جودھپوری جوتے پہنے ہاتھ کا چلو بنا بنا کر آداب تسلیمات کر رہے تھے۔ کہو، ہاں! کلے میں پان، آنکھوں میں ممیرے کا سرمہ! ململ کے چنے ہوئے کرتے میں عطر گل! کہو، ہاں! تم یہاں سے چائے کو چاء، گھاس کو گھانس اور چاول کو چانول کہتے ہوئے گئے۔۔۔۔ اس وقت بھی تم کراچی کو کرانچی کہہ رہے تھے۔" [۱۱]

ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے گئے فن پاروں میں دیکھا گیا ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کرنے والے پاکستان میں رہتے ہوئے یوپی، راجھستان وغیرہ یاد کرتے ہیں۔ایک بڑی تہذیب اور ماحول وغیرہ کی تڑپ میں حال کی ناقدری کا رونا روتے ہیں۔یوسفی ناسٹلجیائی رجحان میں ہندوستان میں پاکستانیوں کے تاثرات احساسات کا یان کرتے نظر آتے ہیں تو ایک منفرد زاویے میں اس رجحان کے انفعال کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان ماضی کی یادوں سے بآسانی چھٹکارا پانے میں اکثر ناکام دکھائی دیتا ہے۔ماضی انسان کو ایک سحر میں مبتلا کرتی ہے کہ حال کے تقاضوں اور رجحانات سے دور رکھتی ہے۔زندگی بھر ماضی کی تڑپ میں جلنا ہی ایسے کرداروں کی نصیب میں خود لکھواتے ہیں۔ میسر سہولیات کی نفی کرتے ہیں۔ تمام تر مادی وسائل کے باوجود جیک آباد اور گوجرانوالہ کو یاد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔بشارت کانپور میں جب ایسے ہندو کو دیکھتا ہے جو کہ گنگا کے قریب رہتا ہے لیکن جیکب آباد کی گرمی کو یاد کرتا ہے تو حیران ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ناسٹلجیا انفعال یعنی کہ جمود کی ترجمانی کے مرے میں دکھایا گیا ہے۔انسان ماضی اور حال میں جب توازن کھو بیٹھتا ہے تو ایسے رویے فروغ پاتے ہیں جو کہ انسانی سماج اور خود انسان کے لیے سزا کا سبب بنتے ہیں۔اردگرد لوگ ایسے حالات میں ان متاثرہ کرداروں کو دیکھ کر ماضی کی یاد کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔اس طرح لوگوں کو ناسٹل جیک جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے۔مشتاق احمد یوسفی ان رویوں کے جمودی پہلوؤں کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "سارا ہندوستان گھوما ہوں۔پر گوجرانوالہ کی بات ہی کچھ اور ہے۔یہاں کی مکئی اور سرسوں کے ساگ میں وہ سواد، وہ سگندھ نہیں۔اور گڑ تو بالکل پھیکا پھوک ہے۔انھوں نے یہاں تک کہا کہ یہاں کے پانی میں پانی بہت ہے۔جب کہ گوجرانوالہ کے پانی میں شراب کی تاثیر ہے۔اس سے ان کی مراد تھی، پانی میں طاقت ہے۔۔۔۔ان کی تمنا تھی کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ اپنے بیٹوں پوتوں کو ساتھ لے کر گوجرانوالہ جائیں اور اپنے مڈل اسکول کے سامنے کھڑے ہو کر فوٹو بنوائیں۔"[۱۲]

ناسٹلجیائی کیفیت کے انفعال والی صورت حال یوسفی مختلف کرداروں کے ذریعے دکھاتے ہیں کہ کس طرح انسانی رویے عدم توازن کا شکار ہو کر انسانی جذبات میں جمود کا سبب بنتے ہیں یوں لگتا ہے کہ کھڑے پانی کے مانند یہ رویے انسان کے لئے نقصان کا سبب بنتے ہیں۔ایک ہندو کردار رمیش اڈوانی کے ذریعے ان حالات کا بیان یوں ہوتا ہے کہ:

> "اس نے یہ تصدیق چاہی کہ جیک آباد اب بھی ویسا ہی حسین ہے یا نہیں جیسا کہ جوانی میں چھوڑ کر آیا تھا؟ یعنی کیا اب بھی چودھویں کو پورا چاند ہوتا ہے؟ کیا اب بھی دریائے سندھ کی لہروں میں شش شش کرتی پلا مچھلیاں دور سے ٹلچاتی ہیں؟ موسم ویسا ہی حسین ہے؟ (یعنی ۱۱۵ ڈگری گرمی پڑتی ہے یا اس پر بھی زوال آ گیا؟) اور کیا اب بھی خیرپور سے آنے والی ہوائیں لو سے پکتی

ہوئی کھجوروں کی مہکار سے بوجھل ہوتی ہیں؟ سبی میں سالانہ دربار اور میلا مویشیاں لگتا ہے کہ
نہیں؟ میں نے جب اسے بتایا کہ میلہ مویشیاں میں اب مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔۔۔۔پوچھنے لگا کیا
اب سندھ میں اچھے مویشی اتنے کم ہوگئے؟ اسے گنگا جمنی میدان ذرا نہیں بھاتا۔ کہنے لگا، "سائیں!
ہم سیدھے، کھردرے ریگ مال ریگستانی لوگ ہیں۔۔۔۔وہ اپنی آنسو دھار پچکاری چھوڑ چکا تو میں
نے باہر آکر انعام اللہ برملائی سے کہا" بھائی میرے! بہت ہوچکی۔ یہ کیسا ہندو ہے جو گنگا کنارے
کھڑا ریگستان کے سپنے دیکھتا ہے!" [۳۱]

ناسٹلجیا انسان کے جذبات کا مثبت پہلو دکھاتا ہے۔ کہ مشکل وقت میں ماضی کے تجربات پر نظر ثانی کی جائے۔ ماضی کے تجربات اور واقعات کو یاد کرکے انسان کو راحت ملتی ہے۔ اور انسان کا مزاج حال کی تلخی میں کمی محسوس کرتا ہے۔ حال کی تلخی کے تناؤ کو کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ناسٹلجیا جذباتی سہارے کی طرح انسان کا ساتھ دیتا ہے۔ ناسٹلجیا انفرادی اور اجتماعی شناخت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اپنے ماضی پر غور کرنے سے انسان کو اپنے عہد کی اجتماعی اخلاقی اقدار، روایات، رجحانات اور میلانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماضی میں ہونے والی غلطیوں سے سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ماضی کے تلخ تجربات اور واقعات کو یاد کرکے اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ناسٹلجیائی رجحان میں انسان خود سے اور دوسروں کے ساتھ مشترکہ یادوں اور تجربات کو زیر بحث لاتا ہے۔ جو کہ سماجی وابستگی کو مضبوط بناتے ہیں۔ یہ ایک احساس پیدا کرتا ہے کہ دوسروں سے وابستہ یادیں انسان کی زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ناسٹلجیا انسان کو حال کے رجحانات سے مکالمہ کرنے کا موقع دیتا ہے کہ ماضی کی جاندار، موثر اقدار سے مستفید ہو کر لمحہ موجود کو بہتر کیا جائے۔ ناسٹلجیائی رجحان میں گزرے عہد کے ہتھیار، مصنوعات، موسیقی، راگ، تعلقات کی نوعیت، خاندان، رشتے، تاریخی مقامات، شخصیات، افکار، نظریات، زبان، موسم، خوراک، ملبوسات، رہن سہن اور اس طرح کے دیگر عناصر انسان کو ماضی کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ ان عناصر کی وجہ سے کوئی انسان ماضی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان ماضی میں جانے کا اعلان کردے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ لمحہ موجود میں کوئی منظر دیکھ کر انسان ماضی کی طرف لاشعوری طور پر روانہ ہوتا ہے۔ ماضی انسان کی یادوں میں زندہ نہ سہی لیکن ختم نہیں ہو سکتا ہے۔ دھندلی دھندلی یادیں موجود ہوتی ہے۔ کوئی انسان اپنے ماضی کی یادوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر سکتا ہے کہ یادیں بیکار ہوتیں ہیں لیکن اس عہد کے ساتھ ایک رومانس البتہ کسی نہ کسی صورت میں وابستہ رہتا ہے۔ جیسا کہ "بشارت" اپنے عہد میں طوائف کلچر کو موجودہ دور کے کلچر سے موازنہ کرکے دیکھتے ہیں:

"اس زمانے میں طوائف ادب اور اعصاب دونوں پر سوار تھی۔ کوئی جوانی اور کہانی اس کے بغیر
آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ رنڈی واحد پرائی عورت تھی۔ جسے آپ نظر بھر
کے دیکھ سکتے تھے۔ ورنہ ہر وہ عورت جس سے نکاح جائز ہو، منہ ڈھانکے رہتی تھی۔ میں نے دیکھا

کہ اب طوائفوں نے گرہستنوں کے سے شریفانہ لباس اور وضع قطع اپنالی ہے۔اب انھیں کون سمجھائے کہ نیک بختو!اسی چیز سے توگھبرا کے دکھیا تمہارے پاس آتے تھے۔گرہستی،پاکیزگی اور یک رنگی سے اکتائے ہوئے لوگ اجنبی بدن سرائے میں رات برات بسرام کے لیے آجاتے تھے۔سو یہ آسرا بھی نہ رہا۔"[۱۴]

ناسٹلجیا کے فکری رویوں میں دیکھا جائے تو ایک پہلو شدت پسندی کا مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا ہے کہ ماضی کی روایات سے چمٹے رہنا، ماضی کی کسک کو اس شدت سے یاد رکھنا کہ حال سے تعلق جزوی حیثیت اختیار کر جائے، ایسے میں ناسٹلجیا حال سے فرار ہونے کے ایک حربے کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔حال کو تسلیم کرنے اور مستقبل کی تیاری کے بجائے ضرورت سے زیادہ ناسٹلجیا ایسے وقت کی آرزو کا باعث بنتا ہے جو کہ دوبارہ نہیں لوٹ سکتے۔ناسٹلجیا جدید عصری رجحانات، ٹیکنالوجی اور سماجی تبدیلیوں کا بائیکاٹ کرتی ہے۔مشتاق احمد یوسفی کرداروں کے ذریعے ان حالات کا مکالمہ کراتے ہیں۔اس رجحان سے وابستہ تصورات کی تصویر کشی کرداروں کے ذریعے کراتے ہیں کہ کس طرح کردار ماضی کی جمودی طاقتوں کو اپنے رومانس کا سامان بناتے ہیں۔ماضی میں لوگوں کو زوال پر آمادہ کرنے والے عناصر کی طرف توجہ مرکوز کراتے ہیں کہ زوال پر آمادہ کرنے والے عناصر کو اب بھی شان وشوکت کا سبب سمجھتے ہیں۔کبوتر بازی، مشغلے انسان کی ترجیحات کا حد سے زیادہ استعمال شوق کس طرح زوال کا سبب بنتے ہیں اس کا بیان یوں کرتے ہیں کہ:

"بہادر شاہ ظفر کی سواری نکلتی تو دو سو کبوتروں کی ٹکڑی اوپر ہوا میں سواری کے ساتھ اڑتی ہوئی جاتی اور جہاں پناہ پر سایہ کیے رہتی۔جب واجد علی شاہ مٹیا برج محبوس ہوئے تو اس گئی گزری حالت میں بھی ان کے پاس چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے، جن کی دیکھ ریکھ پر سینکڑوں کبوترباز مامور تھے۔عرض کیا"اس کے باوجود لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سلطنت پر زوال کیوں آیا! تیغوں کے سائے میں پلنے والوں کے سروں پر جب کبوتر منڈلانے لگیں تو پھر سواری باد بہاری مٹیا برج اور رنگون میں جا کر ہی دم لیتی ہے۔بہادر شاہ ظفر نے کبوتر خانے اور واجد علی شاہ نے پری خانے اور کبوتر خانے پر جتنی رقم اور توجہ صرف کی، اس کا دسواں حصہ بھی اپنے توپ خانے پر صرف کرتے تو فوج ظفر موج بلکہ کبوتر موج کی یہ درگت نہ بنتی کہ ڈٹ کر لڑنا تو درکنار اس کے پاس تو ہتھیار ڈالنے کے لئے بھی ہتھیار نہ نکلے۔"[۱۵]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کی نفسیات کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے۔کہ کرداروں کی ترجیحات کے ذریعے عصری رجحانات اور نظریات کی گٹھری کھولتے نظر آتے ہیں۔کسی رجحان، رویئے اور موضوعات پر مختلف پہلوؤں سے مکالمہ کراتے ہیں۔یہ کردار مختلف زاویوں سے تصویر کے دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔اس کے باوجود مشتاق احمد یوسفی کی کتاب اوران کی شخصیت کو ناسٹلجیک جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے۔حالانکہ دیکھا جائے تو یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا کے دونوں پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے۔"آب گم" کو صرف ماضی پرستی تک محدود کر دیا ہے۔جو کہ

سراسر ناانصافی کے زمرے میں آتا ہے۔"آبِ گم" میں مضمون "حویلی" کے ہیرو کے متعلق ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہے کہ:

"حویلی" کا ہیرو، لکڑی کا بدمزاج تاجر اور عمر بھر ایک معذور بیوی کی خاموشی اور دلسوزی سے خدمت کرنے والا شوہر جسے اپنے بازوؤں کی مچھلیوں پر انشورنس پالیسی سے زیادہ ناز تھا، جب اپنی آتش زدہ دکان سے حویلی کا فوٹو اتار کر گھر لوٹا تو اس کا جھکا ہوا سر زندگی کے ایک ایسے راز سے آگاہ ہوا جو حوادث کی چوکھٹ پر انا کی قربانی دیے بغیر نہیں کھلتا۔ یہ ساری کہانی اسی کشف کے لمحے کی شان نزول ہے۔ اس خاکے کا ہیرو ناسٹلجیا کا شکار ضرور ہے بلکہ آبِ گم کے تمام کرداروں سے زیادہ ماضی سے پیوست ہے، مگر اس کا موضوع ناسٹلجیا نہیں شکست انا کا سانحہ ہے۔ ماضی کی یاد بھی انا کی ڈھال کے سوا کچھ نہیں۔ یہ تو وہ ماحول فراہم کرتی ہے جس میں یہ سانحہ رونما ہوتا ہے۔"[٦١]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں فکری تنوع پایا جاتا ہے۔ ناقدین مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "آبِ گم" کو بہترین الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ ایک ایسی کتاب جس میں انسانی زندگی مختلف پیرائے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یوسفی کی نثر میں فکری و سماجی موضوعات میں عصری رجحانات میلانات کے نمائندہ ہیں۔ ناقدین نے یوسفی کی تحریروں میں عورت مخالف رویے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ مزاح کے پس منظر میں المیہ کشید کرنے والا فن کار کہا۔ اپنی تحریر میں ماضی کی تکنیک سے ماضی پرستی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو کرداروں کے ذریعے اجاگر کیا۔ اس حوالے سے پروفیسر محمد کامران لکھتے ہیں کہ:

"یادوں کا سر شور دریا، دشت امروز میں بہتے بہتے خواب سراب کے "آبِ گم" میں اتر گیا تب اندر ہی اندر، سطح کے بہت نیچے، انسانی تہذیب کی بہت سی اعلیٰ قدروں کو اپنی گمشدہ کڑیاں ملنے لگیں۔ احساس کے گلیشیر پگھلے تو آبِ رواں کے ترنم میں، ابھرتے سورج کی کرنوں نے ڈھیروں سونا گھول دیا۔"[٦٢]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ ناسٹلجیائی رجحان کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے کہ کس طرح کردار ماضی سے شدید لگاؤ کی صورت میں حال یعنی لمحہ موجود سے منہ موڑتے ہیں۔ عصری رجحانات اور جدید نسل کے تقاضوں اور رجحانات سے دور رہتے ہیں۔ گو کہ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ کلاسیکی کتب، شعراء اور کلاسیکی روایات کی قدر کا پہلو بھی نمایاں ہیں۔ کہ جدید دور کے پڑھنے والے نصابی سرگرمیوں تک محدود ہو کر کلاسیکی کلام اور دیگر کلاسیکی رویوں سے نابلد ہیں۔ یوسفی "صبغے اینڈ سنز" میں ان رویوں کی جھلک یوں پیش کرتے ہیں کہ جیسا یہ کردار گزرے عہد کے نہیں بلکہ موجودہ عہد میں بزرگ نسل کے رویے ہیں۔ جو جدید نسل کے تقاضوں سے عدم ہم آہنگی کا

شکار ہوتے ہیں۔ ہر عہد کے رجحانات اور میلانات دوسرے عہد سے مختلف ہوسکتے ہیں۔ ان رویوں میں خلا کا موجود ہونا فطری ہے لیکن ان رویوں کی شدت کو یوسفی نے ناسٹلجیائی رجحان کے دونوں پہلوؤں کی صورت میں قارئین ادب پر عیاں کیا ہے۔ اس کا اظہار "خاکم بدہن" میں یوں ہوتا ہے کہ:

"ایک صاحب کلیات مومن پوچھتے ہوئے آئے اور چند منٹ بعد مولوی محمد اسماعیل میرٹھی مرحوم کی نظموں کا گلدستہ ہاتھ میں لیے ان کی دکان سے نکلے۔ ایک دن میں نے پوچھا اختر شیرانی کی کتابیں کیوں نہیں رکھتے؟ مسکرائے۔ فرمایا وہ نابالغ شاعر ہے۔ میں سمجھا شاید Minor poet کا وہ یہی مطلب سمجھتے ہیں۔ میری حیرانی دیکھ کر خود ہی وضاحت فرمادی کہ وہ وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا کوئی بچہ ٹافی مانگ رہا ہے۔۔۔۔ بہت سی کتابیں وہ اس لئے نہیں رکھتے تھے کہ ان کو سخت ناپسند تھیں اور ان کے مصنفین سے وہ کسی نہ کسی موضوع پر ذاتی اختلاف رکھتے تھے لیکن معدودے چند مصنفین جو اس معتوب مغضوب زمرے سے خارج تھے، ان کی کتابیں دکان میں رکھتے ضرور تھے، مگر کوشش یہی ہوتی کہ کسی طرح بکنے نہ پائیں، کیونکہ وہ انھیں بے حد پسند تھیں اور انھیں سنگوا سنگوا کر رکھنے میں عجیب روحانی لذت محسوس کرتے تھے۔۔۔۔ سنی سنائی نہیں کہتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دیوان غالب (مصور) دکان میں مہینوں پڑا رہا۔ محض اس وجہ سے کہ ان کا خیال تھا کہ دکان اس کے بغیر سونی سونی معلوم ہوگی۔ مرزا کہا کرتے تھے کہ ان کی مثال اس بدنصیب قصاب کی سی ہے، جسے بکروں سے عشق ہو جائے۔"[۱۸]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا مثبت قوت یا انفعال؟ کے تناظر میں ماضی پرستی کے سایے تلے کرداروں کا تجزیہ کیا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ کرداروں کے ذریعے اجتماعی عہد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کسی کردار کو انفرادی نوعیت کا ناسٹل جیک بنا کر پیش کیا ہے۔ کسی فرد کا ناسٹلجیا کی کیفیت میں جانے کا محرک بتایا گیا ہے پھر اس کردار سے مکالماتی انداز میں کرداروں کا مکالمہ کرایا گیا ہے۔ ناسٹلجیا کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے دوران، بعد از ناسٹلجیائی کیفیت کے مختلف مراحل سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے تصور، خیال کی دنیا حقیقت کی دنیا سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ تخیل اور حقیقی دنیا میں فرق کی نوعیت کیسی ہے؟ ایک باریک سا پردہ ہے جب پردہ گرتا ہے تو جیسے انسان نیند سے بیدار ہو کر جاگتا ہے وہی حالت ہے۔ نیند میں انسان خواب دیکھتا ہے جیسے ہی آنکھ کھولتی ہے تو عجیب سماں ہوتا ہے۔ اس طرح انسان تخیل، ماضی کے زور پر ایک تخیلاتی دنیا میں یادوں کی مدد سے زندگی بسر کرتا ہے اگر کبھی حقیقت کا سامنا کرنا پڑ جائے یا ماضی میں جانے کا موقع مل جائے تو ایک احساس رائگانی کا احساس جکڑ لیتا ہے، ایک پچھتاوے کا احساس زندہ مار کر رکھتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی اسی رویے کو بشارت کے ذریعے دکھاتے ہیں کہ کس طرح

ماضی سے شدید وابستگی زوال آمادگی کا سبب بنتا ہے. کانپور میں بشارت ماضی کی یادوں کا موجودہ دور کے کانپور سے موازنہ شروع کرکے یہی حالت ہوتی ہے کہ مجھے ماضی سے وابستہ رومانس والی جگہ پر آنا نہیں چاہیے تھا یہ ماضی کا احساس خوبصورت ہے، ماضی کا تصور خوبصورت ہے، یہاں پر آکر وہ رومانس ہی نہیں رہا، اب ماضی میں کانپور کی یاد والا باب ہی ختم ہونے لگتا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے بشارت ناقابل تلافی نقصان کے رمز کا شکار ہو گیا ہے.. یہ کیفیت نامہ اب گم کے مضمون "دو شہر قصہ" میں دکھایا گیا ہے. مضمون کے عنوان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف جگہوں کا کیفیت نامہ ہے. ہجرت سے قبل کی یادیں اور ہجرت کے بعد طویل عرصہ دور دراز اجنبی ماحول میں گزارتے ہوئے اپنے وطن کو یاد کرنا، جب واپس اپنے علاقے میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ایک احساس رائیگانی کی زد میں ہوتا ہے. یہ شہر دو قصہ مختصر یہ کہ ہم اس انسان کی کہانی ہے جو کہ ایک جگہ طویل عرصہ گزار کر کہیں اور جگہ جاتا ہے تو ایک زمانے تک اپنی یادوں میں مختلف مقامات، شخصیات، یا واقعات یاد رکھتا ہے، انسان کے لاشعور میں یہ چیزیں ایک جگہ سٹور ہوتیں رہتی ہیں اس پر انسان کا قابو نہیں ہوتا، بڑھاپے میں جب انسان کو وہی پرانا ماحول، فضا یاد آتی ہے بلکہ ہوائیں دعوت دیتی ہے تو یہ ایک جذباتی وابستگی کے ساتھ آتا ہے لیکن ظاہر ہے بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ چیزیں بدل گئی ہوتی ہیں ماحول میں تبدیلی ممکن ہے، بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ انسان کی زندگی میں تبدیلی عین فطرت کے مطابق ہے. یہاں تک کہ انسان کے بالوں میں چاندی آنا شروع ہو جاتی ہے. یہ جب اپنے تصور سے بالکل مختلف وہی ماحول دیکھتے ہیں تو عجیب شکستگی کا احساس ہوتا ہے. یہ سمجھتا ہے کہ وہ ماضی، تخیل کس قدر خوبصورت تھا. اب تو یہ بھی نہیں رہا. اس ماضی کے انفعال جمودی رویے کو یوسفی نے کردار کے نفسیاتی تناظر سے اجاگر کیا ہے. مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا مثبت قوت یا انفعال؟ کے تناظر میں ماضی پرستی کے سایے تلے کرداروں کا تجزیہ کیا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ کرداروں کے ذریعے اجتماعی عہد کی تصویر کشی کی گئی ہے. کسی کردار کو انفرادی نوعیت کا ناسٹل جیک بنا کر پیش کیا ہے. کسی فرد کا ناسٹلجیا کی کیفیت میں جانے کا محرک بتایا گیا ہے پھر اس کردار سے مکالماتی انداز میں کرداروں کا مکالمہ کرایا گیا ہے. ناسٹلجیا کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے دوران، بعد از ناسٹلجائی کیفیت کے مختلف مراحل سے پردہ اٹھایا گیا ہے. یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے تصور، خیال کی دنیا حقیقت کی دنیا سے کتنی مختلف ہوتی ہے. تخیل اور حقیقی دنیا میں فرق کی نوعیت کیسی ہے؟ ایک باریک سا پردہ ہے جب پردہ گرتا ہے تو جیسے انسان نیند سے بیدار ہو کر جاگتا ہے وہی حالت ہے. نیند میں انسان خواب دیکھتا ہے جیسے ہی آنکھ کھولتی ہے تو عجیب سماں ہوتا ہے. اس طرح انسان

تخیل، ماضی کے زور پر ایک تخیلاتی دنیا میں یادوں کی مدد سے زندگی بسر کرتا ہے اگر کبھی حقیقت کا سامنا کرنا پڑ جائے یا ماضی میں جانے کا موقع مل جائے تو ایک احساس رائگانی کا احساس جکڑ لیتا ہے، ایک پچھتاوے کا احساس زندہ مار کر رکھتا ہے. مشتاق احمد یوسفی اسی رویے کو بشارت کے ذریعے دکھاتے ہیں کہ کس طرح ماضی سے شدید وابستگی زوال آمادگی کا سبب بنتا ہے. کانپور میں بشارت ماضی کی یادوں کا موجودہ دور کے کانپور سے موازنہ شروع کر کے یہی حالت ہوتی ہے کہ مجھے ماضی سے وابستہ رومانس والی جگہ پر آنا نہیں چاہیے تھا یہ ماضی کا احساس خوبصورت ہے، ماضی کا تصور خوبصورت ہے، یہاں پر آ کر وہ رومانس ہی نہیں رہا، اب ماضی میں کانپور کی یاد والا باب ہی ختم ہونے لگتا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے بشارت ناقابل تلافی نقصان کے رمز کا شکار ہو گیا ہے.. یہ کیفیت نامہ اب گم کے مضمون "دو شہر قصہ" میں دکھایا گیا ہے. مضمون کے عنوان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف جگہوں کا کیفیت نامہ ہے. ہجرت سے قبل کی یادیں اور ہجرت کے بعد طویل عرصہ دور دراز اجنبی ماحول میں گزارتے ہوئے اپنے وطن کو یاد کرنا، جب واپس اپنے علاقے میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ایک احساس رائگانی کی زد میں ہوتا ہے. یہ شہر دو قصہ مختصر یہ کہ ہم اس انسان کی کہانی ہے جو کہ ایک جگہ طویل عرصہ گزار کر کہیں اور جگہ جاتا ہے تو ایک زمانے تک اپنی یادوں میں مختلف مقامات، شخصیات، یا واقعات یاد رکھتا ہے، انسان کے لاشعور میں یہ چیزیں ایک جگہ سٹور ہوتیں رہتی ہیں اس پر انسان کا قابو نہیں ہوتا، بڑھاپے میں جب انسان کو وہی پرانا ماحول، فضا یاد آتی ہے بلکہ ہوائیں دعوت دیتی ہے تو یہ ایک جذباتی وابستگی کے ساتھ آتا ہے لیکن ظاہر ہے بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ چیزیں بدل گئی ہوتی ہیں ماحول میں تبدیلی ممکن ہے، بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ انسان کی زندگی میں تبدیلی عین فطرت کے مطابق ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے بالوں میں چاندی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جب اپنے تصور سے بالکل مختلف وہی ماحول دیکھتے ہیں تو عجیب شکستی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ وہ ماضی، تخیل کس قدر خوبصورت تھا. اب تو یہ بھی نہیں رہا۔ اس ماضی کے انفعال جمودی رویے کو یوسفی نے کردار کے نفسیاتی تناظر سے اجاگر کیا ہے۔

دو مقامات داستان ہے دو شہروں کی روداد ہے۔ انسان ہجرت کر کے اپنے عہد کی یاد میں تڑپتا ہے۔ ایک نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں اور لوگوں کے ساتھ سماجی تعلقات بحال کرنے میں وقت تو لگتا ہے لیکن اس کے لیے دو طرفہ کوششیں بھی ہوتی ہے اگر ایک ہجرت کردہ انسان خود کو نئی آبادی میں تنہا محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے اور ارد گرد کے ساتھ تعلق کو مجبوراً فرضی جوڑے رکھتا ہے تو ایسے میں خلا زور پکڑتا ہے اور ماضی کی طرف جانا تو ناممکن ہے لیکن

اسی ماحول میں واپس جانا ہے تو تخیل کا سامنا جب حقیقت سے ہوتا ہے اور حقیقت سے جب پردہ اٹھتا ہے تو اس کی عکاسی کچھ یوں کرتے ہیں کہ:

"گزشتہ مارچ میں آغا ایک مدت مدید کے بعد اپنے گاؤں گئے۔ لیکن وہاں سے لوٹے تو کافی آزردہ تھے۔ انھیں اس بات سے رنج پہنچا کہ جہاں پہلے ایک جوہڑ تھا جس میں دن بھر بھینسیں اور ان کے مالکوں کے بچے پڑے رہتے تھے، وہاں اب ایک پرائمری اسکول کھڑا تھا۔۔۔ پہلی ٹرین سے یونیورسٹی پہنچے۔ مگر وہاں سے بھی شاموں شام واپس آئے۔ بے حد مغموم و گرفتہ دل۔ انھیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یونیورسٹی اب تک چل رہی ہے! ان جیسے حساس آدمی کے لئے یہ بڑے دکھ اور اچنبھے کی بات تھی کہ وہاں مارچ میں اب بھی پھول کھلتے ہیں اور گلاب سرخ اور سبزہ ہرا ہوتا ہے۔"[۱۹]

ناسٹلجیائی رجحان کوئی نیا رجحان نہیں ہے کہ یوسفی نے سب سے پہلے اس تکنیک کو بروئے کار لایا ہے۔ اس رجحان کے ابتدائی نقوش آغاز سے اردو ادب میں موجود ہیں۔ تقسیم ہند کا واقعہ صرف جغرافیائی سطح پر ایک ملک کے دو ٹکڑے ہونا نہیں ہے۔ یہ ایک خاندان کے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونا ہے۔ جغرافیائی حدود کی سماجی پابندیوں نے ایک ہی خطے کے لوگوں میں اجنبیت کے احساس کو فروغ دیا۔ کل تک ایک ہی جگہ رہنے والے لوگ اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گیے۔ صدیوں پر مبنی تعلقات کی نوعیت میں دراڑ پڑتی ہے۔ آزادی کے بعد یہاں آنے والے لوگوں کو مہاجرین کہا گیا۔ ان کے ساتھ انسانی بنیادوں پر سلوک نہیں کیا گیا۔ فسادات اور تقسیم کے موقع پر انسانوں کے ساتھ ہونے والے غیر انسانی رویوں پر ادب لکھا گیا۔ ان مہاجرین کے دکھ اور فریاد پر ایک عہد کا ادب اجتماعی طور پر ناسٹلجیائی اور فسادات کے موضوع کا منظر پیش کرتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کی نفسیات اور ناسٹلجیائی رجحان کے زمانی، زمینی اور شخصی ناسٹلجیائی کیفیات کا بیان انوکھے پیرائے میں دیکھنے کو ملتا ہے اس حوالے سے ڈاکٹر مظہر احمد لکھتے ہیں کہ:

"آب گم کا ناسٹلجیا دراصل مشتاق احمد یوسفی کا ہی ناسٹلجیا نہیں، ان پاکستانیوں کا بھی ناسٹلجیا ہے جو تقسیم ملک کے بعد ہجرت کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان گئے تھے اور جس نے تادم تحریر انہیں گلے سے نہیں لگایا اور ہمیشہ مہاجر کی تہمت ان پر لگی رہی۔ ان پاکستانیوں میں وہ حلقہ جو ادیب و شاعر کہلاتا ہے اس ناسٹلجیائی کیفیت کا نسبتاً زیادہ شکار رہا۔ انہیں اپنے وطن، اپنے بچپن، جوانی اور زندگی کے ایک بڑے حصے کی یاد ستاتی رہی جس کا اظہار انہوں نے ادب میں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات میں ماضی پرستی کی ایک مسلسل لے ملتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی جن کا اصل وطن راجستھان ہے اس سے کس طرح بچ سکتے تھے، مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ ناسٹلجیا کی خامیوں کے ساتھ ساتھ اس کی برکتوں کا اظہار بھی کر جاتے ہیں

۔ آب گم میں کچھ کردار ماضی پرست ہونے کے باوجود زندہ متحرک ہیں، جبکہ کچھ کردار کے ناسٹلجیا سے دردمندی و محرومی کی کیفیت عیاں ہوتی ہے۔"[20]

مشتاق احمد یوسفی ماضی کو ایک متوازن روئے کے طور پر دیکھنے کے متلاشی ہیں۔انسانی رویوں میں عدم توازن سے ہونے والا نقصانات کا سماجی زندگی پر اثرات دکھاتے ہیں۔اس حوالے سے "زرگزشت" کا ایک کردار "قالب" جو کہ عصری رجحانات کو سرے سے ترجیح نہیں دیتا۔اسے فکری جمود کا شکار دکھایا گیا ہے کہ ناسٹلجیا کس طرح انفعال کی صورت اختیار کرتا ہے۔اس سے پہلے تخلیقی ادب میں ناسٹلجیا کے اس پہلو کو کم دکھایا گیا ہے۔بلکہ ماضی پرستی کو تخلیق کرنے کا جواز تراشا گیا ہے۔یوسفی نے اپنے کرداروں میں اس رویے کے جمودی پہلو کو اجاگر کیا ہے۔اس کردار کے رویے میں ناسٹلجیائی انفعال والی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

"عباد الرحمٰن قالب بلند شہری، ثم ٹونکی، ٹونک کی میونسپل کمیٹی میں متصدی تھے۔مشاہرہ ۳۰روپے چنور شاہی کہ جس کے ۲۰روپے کلدار بنتے تھے۔۔۔۔اپنی متروکہ حویلی سے زیادہ اس شفیق نیم کو یاد کرتے جسے آنگن میں سر جھکائے تنہا کھڑا چھوڑ آئے تھے، کہتے تھے مکان کے عوض مجھے مکان الاٹ ہو گیا۔لیکن حکومت وہ نیم کہاں سے لائے گی جس کی چھاؤں میں نیند کی پریاں جھولا جھلاتی تھیں۔جس کے نیچے ایک بچے نے نبولیوں سے آم کی دکان لگائی تھی۔جہاں بہنیں گڑیاں کھیلیں۔شادی کی شہنائی بجی۔باپ کا جنازہ رکھا گیا۔پھر اس بوڑھے نیم کی سینک سوگوار ماں نے کانوں میں پہن لی۔۔۔۔اب انھیں کون بتاتا کہ یادوں کے ایسے بوڑھے نیم تو ہر گاؤں، ہر دل کے آنگن میں سایہ فگن ہوتے ہیں۔ہاں جب دل کی آگ بجھ جائے تو ان کی جڑیں شریانوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔"[21]

انسان کسی ماحول میں رہتے ہوئے اچھے برے دونوں طرح کے تجربات سے گزرتا ہے۔خوشگوار یادوں کے ساتھ ساتھ دل کو بوجھل کرنے والی یادیں بھی ممکن ہے۔انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اسے قریب کے بجائے دور کی چیزیں پر کشش محسوس ہوتی ہے۔ناسٹلجیا کی کیفیت ہمارے جذبات واحساسات سے تعلق رکھتی ہے۔یہ کیفیت حال کی نسبت ماضی کو قدرے زیادہ پرکشش بنا کر پیش کرتی ہے۔جب پرانے گھر کی یاد انسان کے دامن گیر ہوتی ہے تو اسے وہاں بیتے تجربات کی کسک اور جلن محسوس نہیں ہوتی بلکہ اسے وہاں کی حسین یادیں ہی یاد رہتی ہیں۔ایسی ہی صورت حال "آب گم" کے تمام کرداروں کو درپیش ہے لیکن دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان ناسٹلجیا کا شکار تب ہوتا ہے جب اس کو محسوس ہو جائے کہ اس کا ماضی تو حال سے بہتر تھا۔حال کی تنگی اور ناہمواری ماضی کی طرف انسان کو لاشعوری طور پر لے کر آتی ہے۔مضمون "حویلی" کا کردار ایسی ہی صورت حال کا شکار ہے۔یہ ہجرت کے بعد مہاجرین کے حالات کی جھلک پیش کرتے نظر آتے ہیں۔کہتے ہیں کہ:

"کانپور سے ہجرت کرکے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول، بے روز گاری، بے گھری اس پہ مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھچوالائے تھے۔" ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے۔ اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے۔" ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے" یہ چھوڑ کر آئے ہیں ۔۔۔۔ واسکٹ اور شیر وانی کی جیب میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ درحقیقت ان کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔۔۔۔ میاں! فلیٹ کا الاٹمنٹ آرڈر دکھاؤ قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دکھایا" یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔" اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا" بڑے میاں سنا نہیں؟ الاٹمنٹ آرڈر دکھاؤ۔" قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اتارا، اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے ہیں، اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے" یہ ہے یاروں کا الاٹمنٹ آرڈر، کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمائے گا"[۲۲]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں مزاح والا عنصر مقبولیت اختیار کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے نثر کے فکری پہلوؤں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے کرداروں کی نفسیاتی تجزیے سے واضح ہوتا ہے۔ بعد از تقسیم کے مہاجرین کے مسائل کو دکھایا گیا ہے۔ یہ کسی کردار کا شخصی خاکہ نہیں ہے بلکہ یہ تقسیم کے بعد آنے والے مہاجرین کے ابتدائی مسائل کی طرف اشارہ ہے۔ ناسٹلجیا ہر شخص کی زندگی میں کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ قبلہ کردار کے نفسیاتی تجزیے سے دیکھا جا سکتا ہے کہ بعد از تقسیم کے اجتماعی لوگوں کے مسائل کی نوعیت کیسی رہی۔ اس حوالے سے سید مظہر جمیل لکھتے ہیں کہ:

"ایسی گہری، حقیقی، عمیق، مکمل اور پر تاثیر تصویر ان مہاجر بستیوں کی ہے جو قیام پاکستان کے فوراً بعد کراچی کے کھلے آسمان تلے جگہ جگہ نمودار ہوئی تھیں۔ دیکھیے کیسی مکمل تصویریں مشتاق احمد یوسفی کے موقلم سے نکلی ہیں اور انھیں تصویریں بھی کیوں کہا جائے کہ تصویریں تو جامد ہوتی ہیں اور ان میں وہ تھری ڈائی مینشنل گہرائی کہاں ہوتی ہے جو مشتاق احمد یوسفی ان دھڑکتے ہوئے مناظر میں دکھاتے ہیں۔۔۔۔ بے شک وہ عذاب جن سے مرزائے موصوف جیسے لاکھوں افراد اس عہد میں گزر رہے تھے، گلا دینے والا عذاب ہی تھا۔ یہ صرف زندگی کی آسائشوں سے محرومی کا عذاب نہیں تھا بلکہ قدم قدم پر خودداری کو اپنے ہی ہاتھوں ذبح کرنے، ضمیر کو نیلام چڑھانے اور پل پل منافقت کے دکھ جھیلنے کا عذاب تھا۔ جن سے تارکین وطن کی اکثریت اس تازہ وطن کی فضاؤں میں دوچار تھی اور ذیل میں دیکھیے مشتاق احمد یوسفی نے کیسے تاب دار موتی جڑ دیے ہیں اور یہ نرے لفظ نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے اٹل حقیقتوں سے دمکتے ہوئے گوہر تابندہ لو دے رہے ہیں۔۔۔ بے شک ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے اور جو دنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔"[۲۳]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کو درپیش عصری مسائل امکانات کو دیکھا جائے تو مزاح کو آلہ کار کے طور پر بروئے کار لاتے ہوئے سیاسی سماجی موضوعات کا متوازن پہلو دکھاتے ہیں۔اس کی مثال "آب گم" کے پیش لفظ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ آمریت کو تیسری دنیا کے ممالک کے لیے باعث تشویش قرار دیتے ہیں۔ایشیائی قوموں کے لیے ماضی ولن کے طور پر اس طرح عصری رجحانات اور تحریکوں سے وابستہ انسانی رویوں کو دکھاتے ہیں کہ کس طرح یہ رویے انسانی سماج میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔قیام پاکستان کے بعد ناسٹلجیائی رجحان کے تحت جو ادب لکھا گیا اس میں ماضی کو شدت سے بیان کیا گیا ہے۔جبکہ یوسفی نے کرداروں کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے ماضی سے شدید وابستگی کو طنز کا نشانہ بھی بنایا ہے کہ کسی بھی طرح ماضی سے شدید وابستگی معاشرے کے لیے سود مند نہیں۔اس کے باوجود ناقدین ادب نے یوسفی کو ناسٹلجیک قرار دیا ہے۔یوسفی کی نثر پر عورت دشمنی کے لیبل چسپاں کر دیئے گئے ہیں۔اس حوالے سے طارق حبیب اپنی کتاب "یوسفیات" میں لکھتے ہیں کہ:

"مشتاق احمد یوسفی نے جتنے بھی کردار تخلیق کیے ہیں، ان سب میں ماضی پسندی اور ماضی پرستی کی قدر مشترک ہے، اگر اس عیب کو مثبت انداز فکر میسر آجائے، تو مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں جنم لیتی ہیں ۔۔۔۔ آغا تلمیذ الرحمن چاکسوی، قبلہ بزرگوار، والد بزرگوار، بشارت حسین خان وغیرہ دراصل ایک ہی کردار ہے، بہت سنجیدہ اور غوروفکر کرنے والا کردار، ماضی زدہ، ماضی پرست اور مردم گزیدہ کردار۔یہ درحقیقت مرتی ہوئی روایات اور ڈوبتی ہوئی اقدار کا نوحہ خواں ہے، یہی نوحہ سرائی اسے ماضی پرستی کی طرف راجع کرتے ہے۔موضوعات کے باب میں یوسفی کا ایک اہم موضوع "اقدار کی زوال پذیری" زیر بحث لایا گیا، اس کے پیش نظر، یہ سارے کردار مشتاق احمد یوسفی ہی کی ذات کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔" [۲۴]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانی جذبات و احساسات میں مزاح اور المیہ کے مشترکہ عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں ۔کرداروں کا تعلق عمومی زندگی کے واقعات سے جوڑا گیا ہے ۔قبلہ، بشارت، قالب، تلمیذ الرحمن، صبغے اینڈ سنز اور مرزا عبدالودود بیگ ان کرداروں کی ایک ڈور انسانی حیات اور موضوعات کی بے شمار گرہیں جنہیں کھولنے کو دل ہی نہیں چاہتا اور کوئی گرہ کھل جائے تو مدتوں اس کا غم دل سے نہیں جاتا۔یہ ایک تاثراتی رائے ہے جو کہ غلط بھی ہو سکتی ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہے کہ:

"مشتاق احمد یوسفی کی "آب گم" جب بھی پڑھی، میں میں نہ رہا، تم تم نہ رہنے والی کیفیت ہوئی۔یہ ایسی عجیب کتاب ہے جسے جتنی بار بھی پڑھو، رقت طاری کیے بغیر نہیں رہتی۔حالانکہ بعض خوش طبع حضرات اسے بھی طنزومزاح کی کتاب قرار دیتے ہیں۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ آب گم دل دہلا دینے والی تصویروں کا مرقع ہے۔" [۲۵]

تعلق کوئی بھی ہو اس سے دور جاتے ہوئے انسان کا دکھی ہونا فطری عمل ہے۔ ہم انسان تعلق اور تعلقات کے بندھن میں بندھے لوگ ہیں۔ لوگوں کا ایک دوسرے سے تعلق انسانی رشتوں، شہر، گاؤں اور علاقے کی نسبت سے ہوں تو بیک وقت رشتوں کی کتنی ہی گانٹھیں حیات کی ڈور سے بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ باپ، بیٹا، شوہر، بیوی، دادا، دادی، نانا، نانی اور دوست وغیرہ۔ اس طرح کے بے شمار انسانی تعلقات ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ زندگی ایک ہے اور تعلق کی گرہیں بے شمار! انسان کی زندگی میں لوگوں کا آنا اور جانا تو لگا رہتا ہے یوں تو کہا جاتا ہے کہ ہر ملاقات جدائی کی گھڑی ہوتی ہے۔ ملنا آسان ہے بچھڑنا مشکل۔ بچھڑتے ہوئے یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ شاید پھر نہ مل سکیں۔ جدائی کا احساس انسان کو ختم کرتا ہے۔ اس کیفیت کا شکار یوسفی کا ایک کردار ہوتا ہے جو کہ جدائی کے صدمے کو سہتا ہے اور اس سے وصال بہار کی لذت کشید کرتا ہے۔ یہ کردار "حاجی اورنگزیب" ہے جو کہ بشارت سے شدید محبت پر مبنی تعلق رکھتا ہے۔ حاجی اورنگزیب اور بشارت کے بیچ مکالموں کے ذریعے انسانی تعلقات کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہاں پر ناسٹلجیائی کیفیت کو ایک خط کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ کس طرح حاجی اورنگزیب بشارت کو تنگ کرنے پہنچتا ہے اور جاتے ہوئے ایک خط لکھتا ہے جس کو پڑھتے ہوئے بشارت ٹرین پکڑتا ہے اس کا بیان کچھ یوں ہوتا ہے:

> "خان صاحب کے جانے کے کوئی چھ سات ہفتے بعد ان کا املا کرایا ہوا ایک موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ "بفضل خداوندی یہاں ہر طرح سے خیریت ہے۔ دیگر احوال یہ کہ میں نے اپنے دوران قیام میں آپ کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ناحق آپ تردد کرتے اور صحبت کا سارا لطف کرکرا ہو جاتا۔ پشاور سے میری روانگی سے تین ہفتے پیشتر ڈاکٹروں نے مجھے جگر کا سروسس بتایا تھا۔ دوسرے درجے میں، جس کا کوئی علاج نہیں۔ جناح ہسپتال والوں نے بھی یہی تشخیص کی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہر وقت اپنا دل پشوری کرتے رہو۔ خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو جن کی صحبت تمہیں بشاش رکھے۔ بس یہی تمہارا علاج اور خوگ ژوند (میٹھی زندگی) کا نسخہ ہے۔۔۔۔ میں نے لنڈی کوتل سے لانڈھی تک نگاہ ڈالی۔ آپ سے زیادہ محبتی، خود خرسند رہنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ نظر نہیں آیا۔ چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آ گیا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ طبیعت کا زنگ اتارنے کا بہانہ تھا۔ جتنے دن آپ کے ساتھ گزرے اتنے دنوں سے میری زندگی بڑھ گئی۔۔۔۔ اس بیماری کا خانہ خراب ہو۔ عمر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی چھلکا جا رہا ہے۔ خط لکھوانے میں بھی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ ڈر کے مارے ٹھیک سے کھانس بھی نہیں سکتا۔۔۔ یہاں آ کر پرانے حسابات دیکھے تو پتا چلا کہ ابھی متفرق مدات میں کچھ لینا دینا باقی ہے۔ مجھے سفر منع ہے۔ آپ کسی طرح فرصت نکال کر یہاں شتابی آ جائیں تو حساب دوستاں بیباک (لکھنے والے نے اسی طرح لکھا تھا اور

کیا خوب لکھا تھا) ہو جائے اور آپ کے کابلی والا کو تھوڑی سی زندگی اور ادھار مل جائے۔ نیز، اب نئے مکان اور دالان کا انتظار کون کرے۔ میں نے آپ کے لئے سردست ایک عدد بے چھید چاندنی اور پانچ شاعروں کا انتظام کرلیا ہے۔ والسلام۔" بشارت پہلی ٹرین سے پشاور روانہ ہو گئے۔"[۲۶]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا مثبت اور انفعال دونوں صورتوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ زیادہ تر ناقدین "آب گم" کے پیش لفظ میں کرداروں کے حوالے سے یوسفی کے اقتباس کو بطور ناسٹل جیک پیش کرتے ہیں تو بعض یوسفی کی نثر میں عورت دشمنی کی شکایت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے "شام شعر یاراں" میں خود یوسفی اور ڈاکٹر روبینہ شاہین کے مابین اس موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے:

"فارسی کے ایک فاضل پروفیسر نے اپنی تعارفی تقریر میں فرمایا کہ "یوسفی صاحب کی تحریروں میں جگہ جگہ سیکس کی زیریں لیکن زوردار لہر صاف نظر آتی ہے۔ بار بار ایسے مقامات آتے ہیں جن کی تشریح ہم کلاس روم میں طلبہ طالبات کے سامنے نہیں کرسکتے۔۔۔۔ ایک دن میں نے روبینہ سے پوچھا، پروفیسر صاحبہ، کیا میرے مضامین سے متعلق آپ کے شاگرد بھی ایسے سوال کرتے ہیں جن کا جواب کلاس روم یا بچوں کی موجودگی میں نہیں دیا جاسکتا؟ ہنسی سے فراغت پانے کے بعد فرمایا "آپ نے پوچھا ہے تو عرض کرنا پڑھ گا کہ آپ کا طریقہ واردات مختلف ہے۔ آپ کا قلم، بلکہ پنسل، حیا کا گھونگٹ نکال کے ناچتی ہے۔ مگر چھمچھماتے گھنگرو مرزا عبدالودود بیگ کے پیروں میں باندھ دیتی ہے اور جب پبلک کے اصرار پر گھونگٹ اٹھتی ہے تو ڈارک گلاسز لگا کر آنکھ مارتی ہے! ہمیں ان پر رشک آتا ہے، اس لیے کہ ہم تو اپنے کان تو تہ بھی نہیں پکڑتے۔"[۲۷]

نئے دور میں پرانے دور کی یادیں ایک کسک بن کر چھپ رہا ہے۔ جب کوئی شخص حال سے مطمئن نہ ہو تو پھر وہ ماضی میں کھویا رہتا ہے۔ لمحہ موجود سے بے نیاز رہتا ہے جبکہ لمحہ موجود ہی اصل زندگی ہے۔ لمحہ موجود سے زیادہ کوئی اور شے زیادہ آشکار، زیادہ حقیقی اور لمس پذیر دکھائی نہیں دیتی۔ مگر اس کے باوجود یہ ہم سے مکمل طور پر پہلو بچا کر گزر جاتا ہے۔ زندگی کی ساری اُداسی اس حقیقت میں پنہاں ہے۔ ہر لمحہ ایک چھوٹی سی کائنات کی عکاسی کرتا ہے، جو اگلے ہی لمحے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فراموش ہو جاتی ہے۔ انسانی لاشعور میں ماضی کے تجربات، خواہشات، حسرتوں اور نامکمل خوابوں کا ایک انبار ہوتا ہے۔ لاشعور یادوں کا کباڑ خانہ ہے جہاں آدمی گزرے عہد کے تجربات، واقعات اور اپنی حسرتوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی سنبھال کر رکھتا ہے۔ لاشعور میں پڑے مواد کو یاد کرکے انسان اگر حال کو یکسر رد کرتا ہے تو ایسے میں حال اور ماضی کے مابین کشیدگی بڑھتی ہے اور انسانی رویوں میں عدم توازن پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ حقیقی زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ خیالات کا تانا بانا صرف ماضی اور ماضی کے

خوشگوار اور تلخ یادوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ماضی کے ان تجربات کا ہار گلے میں ڈال کر معاشرے میں سانس لینا، آہیں بھرنا، ہجر کے دکھ سہنا اور اپنے اردگرد انسانوں کے باوجود خود کو تنہا محسوس کرنا ہی ناسٹلجیا کا منفی پہلو ہے۔سید ایاز محمود لکھتے ہیں کہ:

"یوسفی کے تمام کرداروں کی اٹھان معاشرے کے "عام افراد" کے مرہون منت ہے لیکن ان کے دیگر کرداروں کو ہم شخصی رویہ کے کسی ایسے زمرے میں رکھ سکتے ہیں جہاں ہمیں انفرادیت کے ساتھ ساتھ شخصیت کا ایک مخصوص عمومی رنگ بھی ملتا ہے۔یوسفی کے کرداروں کا ایک وسیع تر جائزہ لینے کے بعد ہم ان کو چار پانچ بنیادی زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔۱ماضی تمنائی میں ڈوبے ہوئے :عباد الرحمان قالب، آغا تلمیذ الرحمان،بشارت، والد بزرگوار، قبلہ خسر صاحب، بشیر۔۲ بظاہر اکھڑ ااور درشت، لیکن دراصل گدازدل اور بہترین انسانی اوصاف کے حامل :خان سیف الملوک خان اور اورنگزیب خان۔۳تیز طرار مطلب پرست:نورالحسن شیخ، لطیفی اور مولوی مجن۔ ۴احساس برتری کے شکار :نحاس پاشا کنجو۔۵جھکی،کج بحث:مرزا عبدالودود بیگ اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس۔

ان کرداروں میں کچھ کردار مرکزی ہیں تو کچھ ضمنی۔غیر اہم کوئی بھی نہیں کہ یہ سب اپنی اپنی جگہ انسانی رویوں کی کثیر الجہتی کا نمونہ ہیں۔ ممکن ہے ان کرداروں کے کچھ اور زمرے بنالیے جائیں مگر ملاعاصی ایک ایسا کردار ہے جسے کسی ایک رویئے کے ساتھ مخصوص کیا ہی نہیں جاسکتا ۔وہ بیک وقت جامد بھی ہے اور متحرک بھی زندگی کے بڑے مسائل سے بے نیاز بھی ہے اور بے حقیقت وغیر متعلق مسائل کے حل کرنے کے لئے فکر و اندیشے میں غلطاں پیچاں بھی۔"[۲۸]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا کے دونوں پہلو دیکھے جاسکتے ہیں۔یوں لگتا ہے یوسفی نے کرداروں میں توازن کو برقرار رکھا ہے۔یوسفی کے عہد میں ناسٹلجیائی رجحان کے تناظر میں جو ادب لکھا گیا اس میں ماضی کا غلبہ حاوی دیکھا جاسکتا ہے ۔اس کی مثال میں انتظار حسین کا اول "بستی" خدیجہ مستور کا ناول "آنگن "اور ناصر کاظمی کی شاعری نمایاں ہیں۔ان تخلیقات میں ماضی کی شدّت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔لیکن مشتاق احمد یوسفی نے اپنی نثر میں ماضی کے بیان میں توازن برقرار رکھا ہے۔ماضی کو یاد کرتے ہوئے جذبات اور گزرے عہد کے حسین اور تلخ یادوں میں خود کو سنبھال رکھا ہے۔ماضی کے مثبت اور منفی رویوں کو شخصی و نفسیاتی تناظر میں واضح کیا ہے۔اس کی مثالیں ان کے کرداروں کے رویے سے نمایاں ہیں۔جیسا کہ "قبلہ" "تلمیذ الرحمان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں کہ:

"آب گم داستان ہے زبانی اس مہاجر کی جو یہاں سے رہتے بستے پاکستان چلا گیا تھا۔ایک باب اس بارے میں ہے کہ یہاں اس پر کیا گزر رہی تھی۔دوسرا باب اس بارے میں کہ پاکستان میں اس

پر کیا بیتی (حویلی)، تیسرا باب اس بارے میں کہ اس کی وہاں کی آبائی رہنے والوں سے کیسی بنی یا ان کی تہذیبی شخصیت سے اس کی میزان بیٹھی (کار۔کابلی والا اور آلہ دین بے چراغ) اور چوتھا باب اس بارے میں کہ جب میاں بشارت یادِ وطن سے بے قرار ہو کر واپس کانپور پہنچے تو انہوں نے اس نگر کو کیسا پایا جو کبھی ان کا اپنا دیار تھا (شہر دو قصہ) گویا چار پانچ مضامین میں یوسفی نے پورے برِاعظم کے تہذیبی المیے کو گھڑی بھر میں موزے کی طرح الٹ کے رکھ دیا کہ طنز اور دردمندی کی خاصیت گرم ہوتی ہے۔"[۲۹]

مشتاق احمد یوسفی ماضی کی نفی نہیں کرتے ہیں۔پرانی اقدار کے شیدائی ہیں اور جدید عصری رجحانات سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں فکری موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ان موضوعات میں سیاسی سماجی مسائل، اخلاقی سطح کا دیوالیہ پن، ماضی کی بازیافت اور معاشرے کی اجتماعی اقدار و روایات کی زوال آمادگی کے عناصر کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔یوسفی کی نثر میں سماجی اقدار اور ناسٹلجیا سے پیدا ہونے والی صورتحال نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔"آبِ گم" "زرگزشت" اور "آبِ گم" میں بنیادی موضوعات ہی اقدار و روایات کی زوال آمادگی کے اسباب اور ناسٹلجیائی فضا کے زیرِ اثر میں کرداروں کی نفسیاتی تجزیے قابلِ ذکر ہیں۔اقدار و روایات کی زوال آمادگی اور ناسٹلجیا کے دونوں موضوعات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔تہذیبی اقدار کے بجھتے چراغ کا دھواں اور لاپتہ سماجی روایات کو ناسٹلجیائی کیفیت کو یادوں کے سہارے زندہ رکھتے ہیں۔"زرگزشت" اور "آبِ گم" کا ہر کردار ایک اجتماعی عہد کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔چیخوف کا افسانہ (وارڈن نمبر ۶) کی صورت حال والا ماحول دکھائی دیتا ہے۔جس میں ایک عہد کو ایک ہسپتال کے وارڈ میں دکھایا گیا ہے۔ان حالات کے حوالے سے پروفیسر مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ:

"زرگزشت کو پڑھتے وقت دو اور ادیب یاد آتے ہیں۔ایک چیخوف، دوسرے اپنے رشید احمد صدیقی، چھوٹی چھوٹی غیر اہم بکھری ہوئی باتوں کو یکجا کر کے انہیں اہم بنا دینا زرد، مرجھائے ہوئے بے روح چہروں کے پیچھے زندگی کے امکانات کو دریافت کر لینا، ایک غیر متعینہ راہ میں بدل دینا، چیخوف کے بے جہت فن کی ایک جہت ہے۔یوسفی نے کراچی، بینک اور بینک کے کام کو مزاح نگار کی دوربین اور خورد بین دونوں سے دیکھا ہے۔۔۔۔رشید احمد صدیقی اور یوسفی میں ایک نمایاں اور بنیادی فرق ہے رشید احمد صدیقی ماضی پرست ہیں، یوسفی زمانہ شناس ہیں، ایک پرانی اقدار کا شیدائی، دوسرا جدید اقدار سے نالاں ہے نہ ہراساں، البتہ انہیں برتنے کی قدرت رکھتا ہے اور ان اقدار کو ایمانداری یا بے ایمانی کا معیار نہیں بناتا ہے، ایک درس گاہ ہے دوسرا بینک ہے، رشید صاحب کے جو یہاں گزر چکی ہے وہ زندگی ہے، یوسفی کے یہاں جو گزر چکی ہے وہ زندگی سے زیادہ فن ہے اور جو گزرنے والی ہے وہ تدبیر ہے، یوسفی کو جو دنیا ملی اسے سمجھنا،

برتنا اور جھیلنا رشید صاحب کے بس کی بات نہیں تھی۔یوسفی کا بڑا ہنر یہ ہے کہ انہوں نے اس نئی دنیا میں رہنے کے باوجود آدمیوں سے اپنے رشتوں کو اتنا کمزور نہیں کیا ہے کہ ہر آدمی یا تو بینک کا چوکیدار نظر آئے یا سیٹھ۔"[۴۰]

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا مثبت قوت اور انفعال دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔فکری موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے جہاں مزاح کو آلہ کار کے طور پر بروئے کار لاتے ہیں۔ساتھ ہی واقعات اور کرداروں سے المیہ بھی کشید کرتے ہیں۔ماضی پرستی کو کرداروں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ماضی پرستی کا عنصر کسی انسان کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔اس کا اظہار تحریری صورت میں ہوتا ہے تو یادوں پر صرف ماضی کے واقعات کا غلبہ حاوی ہوتا ہے۔جب یوسفی کے کردار ماضی کو بیان کرتے ہوئے ایک متوازن صورت پیش کرتے ہیں۔اس حوالے سے نعیم بیگ لکھتے ہیں کہ:

"یوسفی صاحب نے اپنے ہر دور میں موضوعاتی تنوع کو بے حد اہم جانا ہے،یوں طنزومزاح سے بھرپور بیانیہ مزید لطیف اور شگفتگی میں نرم و نازک ہوتا گیا،یوں آپ کو "آب گم" کا موضوع اور ذائقہ بالکل مختلف نظر آتا ہے،کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ تجربے نے خود اپنے پیرائے اور لہجے کو متعین کیا۔انسان کی ہجرتوں کا نا مختتم سفر،اس کا عذاب اور اس کا ذائقہ تو انھوں نے اپنے پہلے مجموعے میں ہی رقم کیا تھا،لیکن "زرگزشت" میں وہ سفر اپنے عروج پر تھا۔انھوں نے وجود کے مضطرب اور مثبت عمل کے استعارہ کو وجہ مزاح بنایا،لیکن اسے الہامی یا تصوراتی نہیں ہونے دیا بلکہ اس متن میں انسان کے رنگ بھر دیے۔اہم بات یہ تھی کہ اس بار خودنوشت سوانح عمری "زرگزشت" سے ہٹ کر معاملہ دوسروں کی سوانح عمری بلکہ نوعمری تک پہنچا۔مشاہدے کے وجدان سے ان کے اندر جو گیرائی پیدا ہوئی وہ ان کے قلم میں بے تاب لفظوں کو سرد و گرم کرتے گزری،وہ انھی کی شان تھی کہ اسے سنبھال گئے۔ماضی کی یادوں کے بلاوے پر جو داستانی رنگ یوسفی صاحب نے جمایا وہ کسی اور کے بس کا کھیل ہی نہیں تھا۔یوں سوانح عمری میں پوری کہانی اپنی ہی زبانی سچی داستان کہتے ایسے گزری کہ اسے فکشن کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔جہاں چاہا، باریک بینی کے اتھاہ سمندر میں اتر گئے اور بات سے بات بناتے ہوئے جزیات نگاری کے عیوب کو لاپروائی سے یکسر بصری سانچے میں ڈال دیا۔"[۴۱]

ناسٹلجیا بطور مثبت قوت کے طور انسانی جذبات و احساسات کو فروغ دیتا ہے دیتا ہے اور اس کے مشکل وقت میں سکون و راحت کا سبب بھی بنتا ہے. ماضی کے تجربات اور واقعات پر نظر ثانی انسان کے مزاج کو بہتر بناتے ہیں. خوشگوار لمحات کو یاد کرکے لمحہ موجود یعنی کہ حال کو بہتر بناتا ہے. حال کی تلخی اور تناؤ کو کم کیا سکتا ہے. ناسٹیلجیا ایک جذباتی سہارے کے طور پر کام کرتا ہے جو ہمیں خوشگوار یادوں سے وابستہ رکھتا ہے،خوشی اور اطمینان کے احساس کو

فروغ دیتا ہے۔ ناسٹیلجیا انفرادی شناخت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اپنے ماضی پر غور کرنے سے انسان کو یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ہماری اجتماعی اقدار کیا ہیں؟ ہم اپنے ماضی سے سبق سیکھ کر آگے کیسے بڑھ سکتے ہیں؟ اقداری روایات کو پامالی سے کیسے بچا جائے؟ حال کو بہتر بنانے کے ماضی سے سبق سیکھنا حقیقتی معنوں میں کسی معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی ترقی ہے. پرانی یادوں تک دوبارہ رسائی کے ذریعے ہم اپنی نجی زندگی کے بارے میں بصیرت حاصل کر سکتے ہیں، احساسِ ذات اور خود سے تعلق کو مضبوط بنا سکتے ہیں.

ناسٹیلجیا میں اکثر دوسروں کے ساتھ مشترکہ یادیں اور تجربات شامل ہوتے ہیں، جو سماجی روابط کو موثر بناتے ہیں۔ ماضی کے واقعات،، دوست واحباب، خاندان اور برادریوں کے ساتھ یادیں آپس میں ہمدردی اور اتحاد کا احساس پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں. ناسٹیلجیا ایک دھاگے کی مانند ہے جو کہ لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے، تعلقات کو مضبوط کرتا ہے اور انسانوں کے مابین احساسات و جذبات کو فروغ دیتا ہے۔ ناسٹیلجیا تحریک اور ترغیب کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ماضی کی کامیابیوں، سرخروئی کے لمحات، یادوں پر غور کرنا ہمارے اہداف کو حاصل کرنے میں جذبہ اور حوصلہ افزائی کرتا ہے. ناسٹیلجیا ہمیں ہماری صلاحیتوں اور ان مثبت نتائج کی یاد دلاتا ہے جن کا ہم نے تجربہ کیا ہے، حال اور مستقبل میں اسی طرح کے لمحات پیدا کرنے کے لیے اعتماد اور عزم پیدا کرتا ہے۔ ناسٹیلجیا ہمیں ثقافتی ورثے اور روایات کو محفوظ رکھنے اور ان کو فروغ دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ ماضی کے ثقافتی نمونے، موسیقی، ادب، آرٹ پر نظر ڈال کر، ہم اپنی جڑوں سے تعلق برقرار رکھ سکتے ہیں اور ثقافتی طریقوں کے تسلسل کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ ناسٹیلجیا ہماری ثقافتی تاریخ کی فراوانی اور تنوع کی حوصلہ افزائی کرنے، ثقافت پر فخر اور اجتماعی شناخت کے احساس کو فروغ دینے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ ناسٹیلجیا خود شناسی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ماضی کے تجربات کا جائزہ لے کر، ہم اپنی غلطیوں سے سیکھ سکتے ہیں، ذاتی ترقی کے بارے میں بصیرت حاصل کر سکتے ہیں، اور اپنی زندگیوں میں مثبت تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ ناسٹیلجیا خود کو پرکھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے، ہمیں ماضی کے تجربات پر استوار کرنے اور ذاتی ترقی کے لیے کوشش کرنے کے قابل بناتا ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ناسٹیلجیا مثبت اثرات کا حامل ہوتا ہے لیکن اعتدال کلیدی شرط ہے۔ ماضی میں ضرورت سے زیادہ استغراق ترقی میں رکاوٹ بننے کے امکانات ہوتے ہیں. افراد کو حال اور مستقبل کو مکمل طور پر قبول کرنے سے روکتا ہے. حال یعنی کہ لمحہ موجود میں ایک مثبت سوچ اور مثبت سرگرمی کے ساتھ ناسٹیلجیا کو متوازن رکھنے سے ہمیں ماضی کی قدر کرنے اور اس سے سیکھنے میں مدد مل سکتی ہے اور ہم موجودہ لمحے میں اپنی زندگیوں کو فعال طور پر تشکیل دے سکتے ہیں۔ ناسٹیلجیا کو فرار یعنی کہ موجودہ عہد کے مسائل اور مشکلات سے بغاوت کی ایک صورت کے طور کے پر دیکھا جا سکتا ہے. ناسٹلجیا جو کہ انفرادی ترقی میں رکاوٹ بنتا ہے. لوگوں کو ماضی میں مستغرق رکھتا ہے۔ حال یعنی کہ لمحہ موجود کو حقیقت سمجھنے اور مستقبل کی طرف دیکھنے کے بجائے، ضرورت سے زیادہ

ناسٹیلجیا اکثر ایسے وقت کی آرزؤں کا باعث بنتا ہے جو کبھی دوبارہ نہیں لوٹ کر نہیں آتا. ماضی پر یہ بجا توجہ لوگوں کو اپنی موجودہ زندگیوں کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے اور نئے تجربات اور مواقع کی تلاش سے روکتی ہے. ناسٹیلجیا ایک آسان اور بہتر ماضی کا محض ایک خواب دکھاتا ہے. لمحۂ موجود کی حقیقت کے بارے میں ہمارے تصور کو مسخ کر دیتا ہے۔ ناسٹلجیا کا یہ پہلو ایک جمودی رویوں کو فروغ دیتا ہے اس سے انسان اور معاشرہ جمود کا شکار ہوتا ہے. ماضی جب حال سے آنکھیں بند کرتا ہے تو انسانی رویوں میں خلا پیدا ہوتا ہے جو کہ ناسٹلجیا کے انفعالی پہلو کو اجاگر کرتا ہے. حال میں پیش آنے والے چیلنجز، مسائل اور سماجی مسائل کو آسانی سے منہ موڑ کر کنارہ کشی اختیار کرنا کوئی صحت مند رویہ نہیں. ناسٹلجیا کا یہ پہلو یادداشت کی مسخ شدہ ترسیل کا باعث بنتی ہے. معاشرتی ترقی کے حصول میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں. ناسٹیلجیا غیر ضروری قناعت اور ضروری تبدیلی کے خلاف مزاحمت کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔ ماضی سے چمٹے رہنے سے، افراد ٹیکنالوجی، سماجی اصولوں، اور ثقافتی طریقوں میں ہونے والی ترقی کے خلاف مزاحمت کرنے لگتے ہیں۔ یہ مزاحمت تحقیقی دریافتوں اور ایجادات کی راہ میں رکاوٹ بنتی۔ ہے. سماجی ترقی میں رکاوٹ کے ساتھ لوگوں کو ترقی یافتہ دنیا کے مطابق ڈھالنے سے روکتی ہے۔

ناسٹلجیا کی شدت حال کے ساتھ عدم اطمینان کے احساس میں کرادر ادا کرتا ہے. ادھوری خواہشات کے گھن چکر کو برقرار رکھنے کا محرک بنتا ہے. لمحہ موجود کے ادراک اور ایک بہتر مستقبل کی تشکیل کے لیے کام کرنے کے بجائے، افراد اپنے موجودہ حالات کا ایک مثالی ماضی سے موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ مسلسل موازنہ غیر آسودگی، اداسی، اور حال کے ساتھ سمجھوتہ میں کمی کا باعث بنتا ہے. یوں ناسٹلجیا ضرورت سے زیادہ جذباتی انحصار پیدا کرنے لگتا ہے اور تبدیلی اور نقصان سے نمٹنے کے لیے افراد کی صلاحیت کو روکتا ہے۔ جب افراد جذباتی سہارے اور استحکام کے لیے ماضی کی یادوں پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں، تو وہ زندگی کی مشکل منازل سے گزرتے ہوئے مشکلات کا شکار ہوتے ہیں. یوں ناسٹلجیا ایک انفعال کا سبب بنتا ہے.

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کے نفسیاتی تجزیے سے ان دونوں رویوں کو دکھایا گیا ہے. ان رویوں کی شدت سے پیدا ہونے والے حالات سے دوچار کرداروں کو دکھایا گیا ہے.

حوالہ جات

۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر۔ آزادی کے بعد اردو ناول (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۷ء) ص ۲۴۳۔

۲۔ جاوید، قاضی، ناسٹل جیا کے بارے میں چند باتیں (مشمولہ ماہ نو، مدیر مظفر عباس۔ کراچی: اکتوبر ۱۹۸۰ء) ص نمبر ۲۲۔

۳۔ حسین، انتظار۔ اردو کا مختصر افسانہ پاکستان میں، مطبوعہ سیپ ۱۲ (خاص نمبر) ص ۳۷۵۔

۴۔ احمد، سہیل۔ اردو افسانے کا ناسٹلجیا (ملتان: تدوین پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء) ص ۳۲۔۳۳۔

۵۔ بٹ، عاصم۔ عبداللہ حسین: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء) ص ۵۸

۶۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ آب گم (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن) ص ۲۱۵۔۲۱۶۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۲۳۔

۸۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ چراغ تلے (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء) ص ۵۸۔

۹۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ آب گم (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن) ص ۲۱۹۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۸۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۲۲۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۴۱۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۴۳۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۲۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۷۷۔

۱۶۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر۔ رفتہ و آئندہ (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء) ص ۲۲۳۔

۱۷۔ محمد کامران، پروفیسر۔چاتر مزاح نگار (مشمولہ مشتاق احمد یوسفی: چراغ تلے سے آب گم تک، مرتبہ طارق حبیب۔لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء)ص۳۲۸۔

۱۸۔ یوسفی، مشتاق احمد۔خاکم بدہن (کراچی: دانیال پبلشر، ۲۰۰۰ء)ص۱۹۔۲۰۔

۱۹۔ یوسفی، مشتاق احمد۔چراغ تلے (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء)ص۵۸۔

۲۰۔ مظہر احمد، ڈاکٹر۔مشتاق احمد یوسفی کا آب گم (مشمولہ مشتاق احمد یوسفی: چراغ تلے سے آب گم تک، مرتبہ طارق حبیب۔لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء)ص۲۹۲۔۲۹۳۔

۲۱۔ یوسفی، مشتاق احمد۔زرگزشت (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۸ء)ص۶۹۔۷۰۔

۲۲۔ یوسفی، مشتاق احمد۔آب گم (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن)ص۴۵۔

۲۳۔ مظہر جمیل، سید۔آشوب سندھ اور اردو فکشن (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء) ص۱۴۴۔۱۴۷

۲۴۔ حبیب، طارق۔یوسفیات (اسلام آباد: دوست پبلیکیشنز، ۲۰۰۳ء)ص۱۵۰۔۱۵۱۔

۲۵۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر۔رفتہ و آئندہ (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء)ص۲۱۹۔

۲۶۔ یوسفی، مشتاق احمد۔آب گم (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن)ص۲۱۲۔۲۱۴۔

۲۷۔ یوسفی، مشتاق احمد۔شام شعر یاراں (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن)ص۳۸۱۔۳۸۲۔

۲۸۔ ایاز محمود، سید۔ملا عاصی... آب گم کا ایک کردار (مشمولہ اجرا یوسفی نمبر، مدیر اقبال خورشید۔کراچی: فضلی پرنٹر، ۲۰۱۱ء)ص۹۹۔۱۰۰۔

۲۹۔ محمد حسن، پروفیسر۔ست رنگے لمحوں کا تاجدار: مشتاق احمدیوسفی (مشمولہ مشتاق احمد یوسفی: چراغ تلے سے آب گم تک، مرتبہ طارق حبیب۔لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۷ء)ص ۲۴۷۔

۳۰۔ حسین، مجتبی۔ زر گزشت (مشمولہ مشتاق احمد یوسفی: چراغ تلے سے آب گم تک، مرتبہ طارق حبیب۔ لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۷ء) ص ۱۹۴۔۱۹۵۔

۳۱۔ بیگ، نعیم۔ مشتاق احمد یوسفی :مزاح کے سنگھاسن پر (مشمولہ اجرا یوسفی نمبر، مدیر اقبال خورشید۔ کراچی: فضلی پرنٹر، ۲۰۱۱ء) ص ۴۹۔۵۰۔

ماحصل

دور حاضر میں ناسٹلجیا ایک ادبی رجحان کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کے عناصر سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ عالمی ادب اور گذشتہ صدی میں ہونے والے سیاسی و سماجی منظر نامے سے انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کا ماضی اس کے لحہ موجود یعنی کہ حال سے بہتر تھا۔ بیسویں صدی تغیرات، انقلابات اور رد انقلابات کی صدی ہے۔ دو عظیم جنگوں سے پیدا ہونے والے سیاسی و سماجی تباہیاں، تقسیم ہند، ۱۹۶۵ء جنگ، سانحہ سقوط ڈھاکہ، سقوط سویت یونین، نائن الیون کا واقعہ، ایٹمی ہتھیاروں کی نمائش اور تباہ کن نتائج سے بین الاقوامی اور مقامی سطح پر جو انتشار کی فضا قائم ہوتی ہے۔ یہ امکانات اور صورت حال ناسٹلجیائی رجحان کو فروغ دینے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ دنیا بھر کے ادب سمیت اردو ادب میں ماضی کی یاد شدت کے ساتھ بطور مرکزی موضوع بنتی ہیں۔

اردو ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کے ابتدائی نقوش پہلے سے موجود ہے۔ اردو زبان و ادب کی ارتقاء ایسے دور میں ہوتی ہے جو کہ انتشار اور سیاسی و سماجی ناہمواریوں کا دور تھا۔ حملہ آوروں کی وجہ سے سامراجی تسلط اور سامراجی سوچ نے مقامی لوگوں کے اذہان اور نفسیات کو براہ راست متاثر کیا۔

ناسٹلجیائی رجحان کا محرک ہجرت، درد، کرب اور معاشی و سیاسی عدم استحکام ہے۔ اردو ادب کے شعراء اور نثر نگاروں نے اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات سے پیدا ہونے والے حالات کا نوحہ اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ ہجرت کے تجربات، معاشی و اقتصادی مسائل کا اظہار، نئے ماحول سے وابستہ مسائل، سامراجی پالیسیوں سے پیدا ہونے والے انسان دشمن رویوں، شاندار ماضی اور ماضی کی یادوں کی کسک ان کی تخلیقات میں شروع سے موجود رہی ہے۔ ادیب معاشرے کا حساس طبقہ ہوتا ہے۔ ادیب امکانات کے پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ میر تقی میر اور غالب کی تخلیقات میں اپنے عہد کی سماجی ناہمواریوں کے ساتھ گزرے عہد کی یادیں دھندلی دھندلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ سماجی ناہمواریوں کا یہ سلسلہ دور حاضر تک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہا۔

بیسویں صدی میں ہونے والے عالمی اور مقامی واقعات کا اردو ادب پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ ان عالمی اور مقامی واقعات نے برصغیر کے لوگوں کے نفسیات کو متاثر کیا۔ اجتماعی واقعات سے پیدا ہونے والے حالات نے انسان کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کیا کہ ان کا ماضی حال سے بہتر تھا۔ مقامی سطح پر برصغیر کے لوگ تقسیم ہند، ۱۹۶۵ء جنگ، سقوط ڈھاکہ، سقوط سویت یونین اور نائن الیون سے پیدا ہونے والے واقعات سے ذہنی و جسمانی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ عالمی سطح پر دو جنگیں، ۱۹۱۷ء انقلاب اور جلیانوالہ باغ واقعہ سے جو فضا بنتی ہے اس سے لوگوں کی اجتماعی نفسیات پر براہ راست اثرات پڑتے ہیں۔ اس کے ساتھ مقامی لوگوں کو درپیش مسائل، ہجرت، معاشی عدم استحکام، شناخت

کے مسائل اور دہشت گردی جیسے ذیلی مسائل انسان کو داخلی و خارجی طور پر انفرادی اور اجتماعی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ انسان حال کے مسائل سے چھٹکارا پانے کی غرض سے ماضی کی بازیافت، ماضی کی اقدار اور روایات کو یاد کرتا ہے ۔ انسانی رویوں پر سماجی ناہمواریوں کے اثرات کا ادراک ان کے تخلیقات کے مطالعے و تجزیے سے کیا جاسکتا ہے کہ ادب زندگی اور معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ادب میں ناسٹلجیا ایک مربوط رجحان کے طور پر سامنے آتا ہے اور تخلیق کاروں کے ہاں بطور مرکزی موضوع کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ دور حاضر کا انسان اپنے ماضی کے اطمینان اور راحت کا متقاضی ہے جو ان سب سماجی و سیاسی واقعات سے قبل کسی نہ کسی صورت میں اسے میسر تھی حال کی صورت حال کے بجائے ماضی ایک خوشگوار تناظر مہیا کرتا ہے۔

ناسٹلجیا کو ابتدا میں ایک نفسیاتی بیماری کے معنوں میں لیا گیا۔ اس کے پس منظر میں ایک طویل داستان ہے۔ جس کا مفہوم مختصر یوں ہے کہ نفسیات کی ایک شاخ ہے بیماری کے طور پر سامنے آتی ہے۔ گھر کی یاد اور اپنوں سے دوری کے سبب پیدا ہونے والے جذباتی لگاؤ اور اس کے اظہار کو شروع میں ناسٹلجیا کے نام سے یاد کیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناسٹلجیا کی معنویت، نوعیت، اہمیت اور اس رجحان کے محرکات کا تجزیہ کیا جانے لگا۔ کسی سماجی واقعے سے پیدا ہونے والے حالات سے متاثرین کے تجربات احساسات کے بیان کو جب ایک پیرائے میں رکھا گیا تو اس کو ماضی پرستی اور ناسٹلجیا کہا گیا. دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان زندگی میں کئی طرح کے کیفیات و تجربات سے گزرتا ہے۔ خوشی، غمی، حیرت اور مسرّت یہ انسانی شخصیت کا لازمہ ہیں۔ ناسٹلجیا کو بھی ایسا ہی کیفیت نامہ کہا جاسکتا ہے۔ جس میں انسان ماضی کی جانب لوٹ جانا چاہتا ہے۔ ماضی کی حسین اور تلخ یادیں انسان کی زندگی کے تعاقب میں رہتی ہیں۔

نفسیات اور ناسٹلجیا کا باہمی ربط گہرا ہے۔ ناسٹلجیا ایک پیچیدہ اور طاقت ور کیفیت کا مجموعہ اظہار ہے۔ ناسٹلجیا ماضی کے تجربات، مقامات اور لوگوں کی واضح یادوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو کہ بعض اوقات مثبت اور خوش گوار جذبات و احساسات سے جڑا ہوتا ہے۔ اس میں ایک تلخ حقیقت بھی ہے جو کہ اداسی یا حسرت سے جڑی ہوتی ہے۔ ماہرین نے ناسٹلجیا کو نفسیات کی ایک شاخ بتایا ہے۔ ناسٹلجیائی کیفیت میں نفسیاتی و ذہنی بیماری کی تشخیص کی گئی ہے۔ اس لیے ناسٹلجیا کی کیفیت کو اول اول ماہر نفسیات دان ہوفر نے ایک نفسیاتی مرض قرار دیا۔ نفسیات انسانی دماغ کا سائنسی مطالعہ ہے۔ لوگ کیسے سوچتے ہیں؟ لوگوں کے عمل اور رد عمل کے پس پردہ محرکات کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ نفسیات ان سوالات کو سمجھنے کا ایک فریم ورک مہیا کرتا ہے۔ یادداشت اور ناسٹلجیا کے باہمی تعلق سے نفسیات اور نفسیاتی مباحث کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ نفساتی عناصر کی تلاش و تعین ناسٹلجیائی رجحان کے علمی اور جذباتی

بصیرت کا محاکمہ کرتی ہے۔ناسٹلجیا انسانی صحت و مزاج پر مثبت اثرات رکھتا ہے خصوصی طور پر سماجی تعلقات میں ایک دوسرے سے تعلقات اور احساس کی صورت میں یہ ایک خوشگوار لمحات کو فروغ دیتا ہے۔ناسٹلجیائی رجحان میں کوئی انسان اپنے ماضی اور بچپن کی یادوں کو یاد کر کے ایک سکون اور راحت محسوس کرتا ہے۔اطمینان اور تسلی کے محسوسات کی یہ اعلیٰ سطح ہوتی ہے۔دوست، احباب اور خاندان کے لوگوں کو یاد کرتے ہوئے افسردگی اور اضطراب کی سطح ہو جاتی ہے۔ناسٹلجیا سماجی رابطے کے جذبات و احساسات میں معاون ثابت ہوتا ہے لیکن ناسٹلجیا کے صحت و مزاج پر منفی اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔اس لیے بعض جگہوں پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ناسٹلجک (Nostalgic) ہے۔حال سے فرار ہونے اور درپیش مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اور ذہنی راحت کے لیے اگر کوئی شخص ماضی میں جاتا ہے تو یہ ایک قسم کی فراریت کے زمرے آئے گا۔موجودہ مسائل سے منہ موڑنا، آنکھیں بند کرنا اور انسانی سماج کے نشیب و فراز کا سامنا کیے بغیر ماضی پر اس قدر مستحکم ہونا کہ حال کی پرواہ کرنا چھوڑ دیا تو ایسے میں یہ ناسٹلجیا ایک منفی عمل کی عکاسی کرتا ہے۔ماضی سے اس قدر مطمئن ہو کر اپنی زندگی میں آگے بڑھنے سے قاصر ہونا ایک ندامت کا سبب بنتا ہے۔حال سے لطف اندوزی اور اس کی نوعیت و اہمیت سے آنکھیں بند کرنا ناسٹلجیا کا منفی پہلو ثابت ہو سکتا ہے۔نفسیات اور ناسٹلجیا کے درمیان باہمی ربط کثیر الجہتی ہے۔اگر دیکھا جائے تو ناسٹلجیا کے دماغی صحت اور انسانی شخصیت پر مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں لیکن منفی جذبات و احساسات سے نمٹنے کی حکمت عملی کا ذریعہ بھی ناسٹلجیا کے امکانات و تشریحی انداز ہے۔ناسٹلجیا کے امکانات کو بروئے کار لاتے ہوئے فن پاروں کی تشریح و توضیح ہو سکتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جو ادب لکھا گیا ہے اس میں ماضی پرستی اور ناسٹلجیا کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔ہجرت کے تجربات، ہجرت کے بعد نئے ماحول اور نئے خطے کے مسائل سے دوچار ہونے کے بعد ماضی کی تہذیب، اقدار اور روایات کو یاد کرتے ہوئے تخلیق کاروں نے شعری اور نثری پیرائے میں اپنے تجربات محسوسات کو بیان کیا ہے۔زیادہ تر لکھنے والے ماضی کے تجربات و محسوسات لکھتے ہوئے توازن برقرار رکھنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔اس طرح ان تخلیقات کی بناء پر ناقدین نے ان لکھاریوں کو ماضی پرست اور ناسٹل جیک جیسے القابات سے نوازا گیا۔ماضی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ماضی انسان کی یادوں میں کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہتا ہے۔کبھی خوشگوار یادوں کے طور پر تو کبھی دل کو بوجھل کرنے کی صورت۔مگر اس ماضی کی کسک اور تڑپ کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے۔ماضی میں حد سے زیادہ کھجانے اور ہر وقت اس کی یادوں میں ڈوبے رہنے کی عادت ان لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے

جو حال سے مطمئن نہیں ہوتے۔ حال اور ماضی میں توازن بر قرار نہ رکھا جائے تو انسانی رویوں میں نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں جو کہ انسان اور معاشرے کے لیے تشویش کا سبب بنتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی نثر کا عمومی تعارف ایک مزاح نگار کے طور پر ہوتا ہے۔ ہنسنے ہنسانے کے حوالے سے یوسفی کی کتابوں کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ یوسفی کی عمومی پہچان ہے۔ ناقدین ادب یوسفی کی نثر میں فکری، سیاسی، سماجی اور نفسیاتی موضوعات میں تنوع اور وسعت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تخلیق کار اپنے عہد کے عصری رجحانات، رویوں اور فکریات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قیام پاکستان کے بعد مشتاق احمد یوسفی نے راجستھان سے پاکستان کا سفر مختلف زاویوں سے کیا ہے۔ ایک طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہجرت کو ایک خوشگوار تہذیبی سفر کا نقطہ آغاز کہا گیا ہے کہ پاکستان کا جھنڈا دیکھ کر اس کو چومتے ہیں۔ اپنی سوانح عمری "زرگزشت" میں پاکستان کی طرف ہجرت کو ایک ایسے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ ہجرت کا منفرد پہلو ہے تو دوسری جانب ایک بڑے مقصد اور بڑی سطح پر قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرنے والے لوگوں کا دکھ دکھایا ہے کہ وہ وقت کی عزّت سے روٹی کے لئے اپنی خودی اور انا کے لئے ترستے ہیں۔ "آب گم" میں "قبلہ" کے زبانی مہاجرین کی دکھوں اور انسانی رویوں کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ ناسٹلجیا کے تناظر میں یہ واضح کرتا ہے کہ کردار ماضی پرستی اور ناسٹلجیائی رجحان کے جذبات کی رو میں بہتے دکھائی نہیں دیتے۔ کرداروں پر ناسٹلجیائی رجحان کے اثرات و محرکات سامنے پیش کرتے ہیں۔ ماضی سے وابستہ کرداروں سے مکالمہ کرتے دیکھا گیا ہے کہ ماضی سے وابستگی اور عصری رجحانات اور تقاضوں کو نظر انداز کر کے کیسے انسانی روئے فروغ پاتے ہیں۔ ان رویوں سے پیدا ہونے والے حالات کو قارئین پر عیاں کیا گیا ہے۔ ناسٹلجیا کا سبب صرف ہجرت یا تقسیم تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ ناسٹلجیائی رجحان کا شکار ہونے والے کرداروں کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے دیگر عوامل اور عناصر کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کہ انسان کی بڑھتی ہوئی عمر، تنہائی اور کوئی ایسا واقعہ جس کے سبب انسان خود کو آبادی میں اور بھیڑ میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ حال کی تنگی، معاشی عدم استحکام اور شناخت سے زیادہ انسان کے قریبی رشتہ داروں کا دنیا سے کوچ کرنا انسان کو ماضی کی یادوں میں لے کر جاتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں موضوعات کی کثیر الجہتی ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان کو ایک ایسے زاویے سے کرداروں کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ اس رجحان کے حامل مثبت قوت اور انفعال والی کیفیات واضح دکھائی دینے لگتی ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیائی رجحان کا پہلو شخصیت کا عکاس نہیں۔ یوسفی نے ماضی پرستی کے غالب ہونے کا سبب دکھایا ہے۔ کرداروں کو ماضی میں لے کر جاتے ہیں۔ اس ماضی میں جس کو یہ متاثرہ لوگ یاد کرتے ہیں۔ دکھایا

جاتا ہے کہ تصوراتی دنیا اور حقیقی دنیا میں جو پردہ ہے جو تخیل ہے وہ کتنا خوبصورت ہے۔ماضی کی کسک ہے جیسا انسان نیند والی کیفیت میں ہو۔جب سوئے ہوئے انسان کی آنکھ کھولتی ہے تو حقیقی دنیا اس کے برعکس ہوتی ہے۔یوسفی ماضی پرستی کے اس انفعالی رویے کو دکھاتے ہیں۔یہ کردار ماضی میں وقت گزارنے والے دورانیے پر افسوس کرتے ہیں۔ناسٹلجیائی رجحان اردو ادب میں نیا رجحان نہیں ہے کہ اس سے قبل اس تکنیک کے تحت پہلے ادب تخلیق نہیں ہوا۔یوسفی نے اس رجحان سے وابستہ مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ جمودی رویوں اور انفعال کی صورت حال کو بھی اجاگر کیا ہے۔دیکھا جاسکتا ہے کہ ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے گئے ادب میں کرداروں پر ماضی کا غلبہ زیادہ ہے۔ماضی کی یادوں سے چھٹکارا پانے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔اس طرح تخلیق کار کے رویے میں ماضی کا عنصر ان کی شخصیت پر بھی عیاں دیکھا گیا ہے اس سے ماضی پرست اور ناسٹلجیک جیسے القابات سے نوازا گیا ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے کرداروں کے رویے میں ناسٹلجیائی رجحان کے سرائت کرنے کو صرف ہجرت کرکے پاکستان میں نہیں دکھایا گیا ہے بلکہ سکھ اور ہندو کرداروں کو ہندوستان کی سرزمین پر دکھایا ہے کہ وہاں پر ان کو آسائشوں کی کوئی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود وہ گوجرانوالہ اور جیک آباد کی یاد میں تڑپتے ہیں۔اس طرح کرداروں کو صرف دکھایا نہیں گیا ہے بلکہ دوسرے کرداروں کے ذریعے اس منفی روئے پر مکالمہ کرایا گیا ہے کہ کیسا ہندو ہے جو گنگا کنارے بیٹھ کر جیک آباد کی گرمی کو یاد کرتا ہے۔مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیائی رجحان ایک متوازن فکر کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ناسٹلجیائی رجحان کے مثبت امکانات اور انفعال کی صورت حال کو کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔اس طرح کرداروں کے نفسیاتی مطالعے سے اپنے عہد کے دکھ، درد، محرومیاں، سیاسی وسماجی عدم استحکام اور معاشی بدحالی سے جو حالات پیدا ہوتے ہیں اس میں لوگوں کی عمومی تاثرات کو دکھایا گیا ہے۔مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں نفسیاتی عناصر ناسٹلجیا کے تناظر میں مطالعہ کرتے ہوئے مثبت پہلوؤں اور انفعال کی کیفیات کو یوسفی کے اقتباسات اور ناقدین کی آراء کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

کتابیات

۱۔ آغا، وزیر۔اردو ادب میں طنز و مزاح۔لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۶ء

۲۔ احمد، مظہر۔مرتبہ مشتاق احمد یوسفی (ایک مطالعہ)۔دہلی: شبانہ پبلشر، ۱۹۹۶ء

۳۔ النساء، فخر۔رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کا تقابلی جائزہ۔لاہور: ایم اے اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۹۰ء

۴۔ انصاری، نامی۔آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح۔دہلی: معیار پبلشرز، ۱۹۹۷ء۔

۵۔ پاریکھ، رؤف۔اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۶ ۔۹۷ء

۶۔ چندنارنگ، گوپی۔ادبی تنقید اور اسلوبیات۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

۷۔ چوہدری، فوزیہ۔نقد ظرافت۔لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۸۔ حبیب، طارق۔یوسفیات، مشتاق احمد یوسفی: سوانح، فکر اور فن۔اسلام آباد: دوست پبلشرز، ۲۰۰۳ء

۹۔ حبیب، طارق۔مشتاق احمد یوسفی: شخصیت و فن۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء

۱۰۔ حبیب ،طارق۔مرتبہ مشتاق احمد یوسفی ("چراغ تلے "سے "آب گم" تک)۔لاہور: شرکت پبلشرز، ۱۹۹۷

۱۱۔ خان، آفتاب مسرور عالم۔اردو نثری ادب میں طنز و مزاح: روایت اور فن۔اسلام آباد: ایچ ای سی، ۲۰۰۶ء

۱۲۔ رشید، طارق۔آب گم: تنقیدی مطالعہ۔ملتان: ایم اے اردو، زکریا یونی ورسٹی، ۱۹۹۲ء

۱۳۔ سلطانہ بخش، ایم۔ داستانیں اور مزاح۔لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء

۱۴۔ سہیل، سید عامر۔قرۃ العین حیدر: خصوصی مطالعہ۔ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۳ء

۱۵۔ شیخ، محمد اصغر۔ مشتاق احمد یوسفی بحیثیت مزاح نگار۔ ملتان: ایم اے اردو، زکریا یونی ورسٹی، ۱۹۸۴ء

۱۶۔ صدیقی، رشید احمد۔ طنزیات و مضحکات۔ دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۱ء

۱۷۔ عابد، سید عابد علی۔اسلوب۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء

۱۸۔ عسکری، محمد حسن۔ تخلیقی عمل اور اسلوب۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء

۱۹۔ کوثر، شہناز۔مشتاق احمد یوسفی: فن و شخصیت۔بہاولپور: ایم اے اردو، اسلامیہ یونی ورسٹی، ۱۹۸۹ء

۲۰۔ مسعود، میمونہ۔ مرتبہ منتخبات یوسفی۔ حیدرآباد: وطن پبلشر، ۲۰۰۵ء

۲۱۔ مظہر جمیل، سید۔آشوب سندھ اور اردو فکشن۔کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء

۲۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر۔رفتہ و آئندہ۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء

۲۳۔ نواز، حق۔ مرتبہ اردو ادب بیسویں صدی میں۔لاہور: قبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء

۲۴۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ چراغ تلے۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۳ء

۲۵۔ ایضاً۔خاکم بدہن۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۳ء

۲۶۔ ایضاً۔زرگزشت۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۶ء

۲۷۔ ایضاً۔آب گم۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۰ء

۲۸۔ ایضاً۔شام شعریاراں۔لاہور:جہانگیر بکس،۲۰۱۴ء